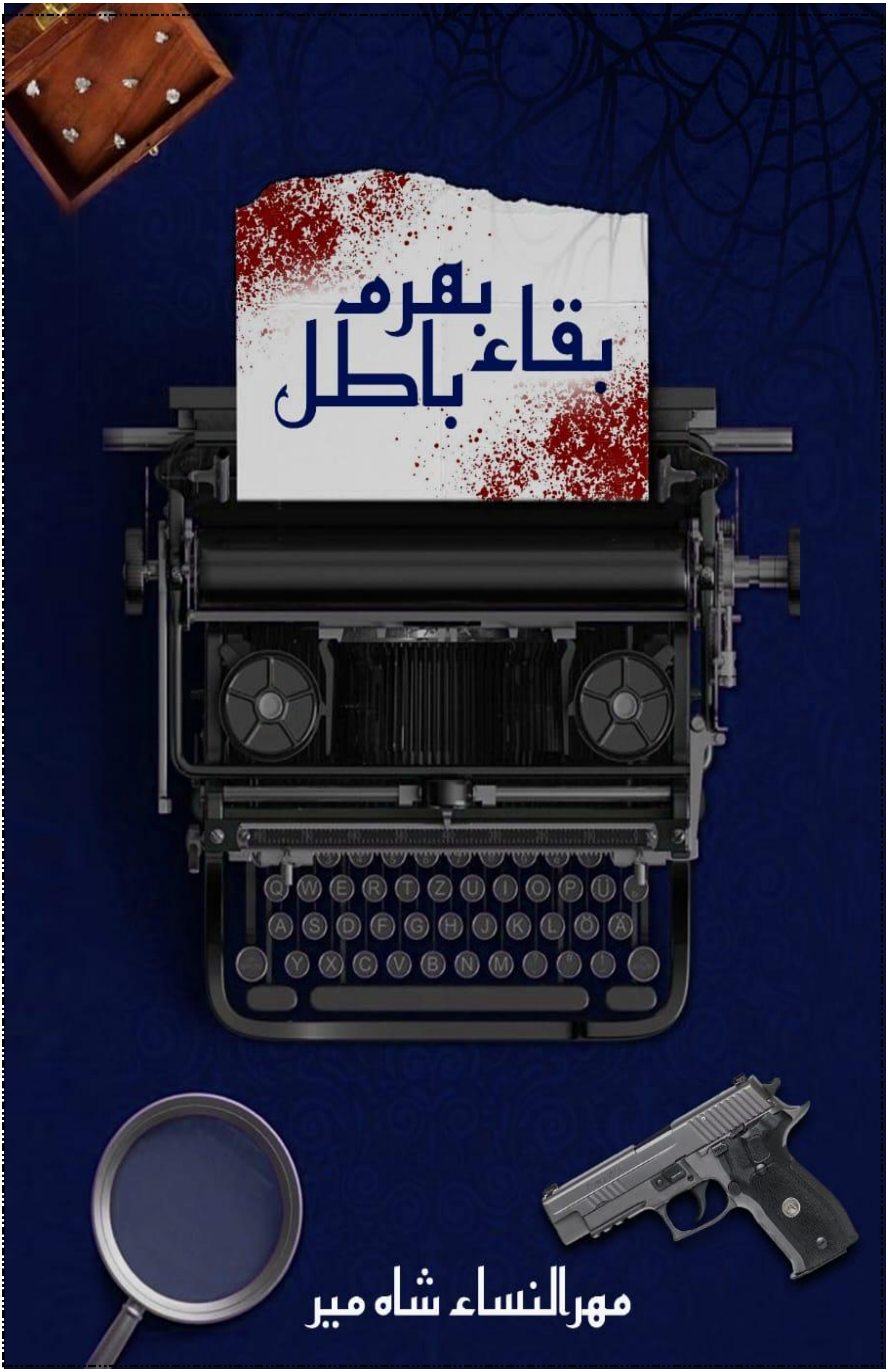
بقاء بھرم باطل
مہرالنساء شاہ میر

بھرم،بقا،باطل؟

مہرالنساءشاہ میر کے قلم سے

انتساب

اللہ کے نام، وہ جس نے لکھوایا اور وہی جو لکھوا رہا ہے۔

انتباہ

یہ کہانی پر تشدد مناظر، قتل، ذہنی دباؤ، جسمانی استحصال، اور خون ریزی پر مبنی ہے۔ نیز اس کہانی میں خودکشی کا ذکر، جنسی اور دماغی تشدد چند قارئین کے لیے تکلیف دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

اگر یہ موضوعات آپ کی ذہنی صحت یا شوق مطالعہ متاثر کر سکتے ہیں تو براہ کرم احتیاط کریں۔

شکریہ۔

قسط نمبر ایک

بخره اول : بهرم

تاریکی اور برف

آسمان پر چمکتے ہوئے ہلال کی نقرئی روشنی مدھم تھی۔رات تاریک تھی،ایسے جیسے کسی سیاہ کار کی غیر روشن قبر۔ایسی سیاہ راتیں محض آسیب زدہ کہانیوں میں ہوتی ہیں،یا پھر یہ وہ رات تھی جب قدرتی سیاہی سے زیادہ کسی کے اعمال ناموں کی سیاہی آنکھوں کو چندھیانے والی تھی؟

کسی عمارت کی سنسان راہداریوں میں اس پہر جو واحد آواز تھی وہ اس لڑکی کے سفید بوٹوں کی تھی۔یہ آواز ایک پل کو پر سراری کا اعلان تھی تو اگلے پل دغا بازی کا پیغام دیتی،ایک لمحہ اعلانِ امن تو اگلا لمحہ اعلان رزم۔قدیم عمارت کی دیواروں میں لگے فانوس کی روشنیوں میں اس لڑکی کا چہرہ روشن ہوتا،پھر نقوش دھندلے،پھر مدھم،پھر روشن۔اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا۔بوڑھی عمارت کی بوڑھی دیواریں رازداری کا تہیہ کیے پوری شان سے کھڑی تھیں۔ان پر ٹنگی قدیم مصوری رات کے اس پہر خوف کی پہرے دار لگ رہی تھیں۔اور راہداریوں کی تنہائی کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ۔

لکڑی کے ایک بھاری دروازے کے باہر قدموں کی چاپ تھمی تو اگلے ہی لمحے دروازہ کھلنے کی چرچراتی کانوں

کو چبھنے والی آواز گونجی۔ بھاری بوٹوں والی لڑکی اندر داخل ہوئی اور کمرے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ بھاری مخملی پردے کھڑکیوں پر گرے ہوئے تھے، اگر اٹھے ہوتے تب بھی باہر محض اس شہر کی تاریکی دکھائی دیتی یا پھر برف۔

پلنگ کی بے ترتیب چادر کے اوپر کئی چیزیں کھلی پڑی تھیں۔ کپڑے، کاغذ، قلم، دوات، لیپ ٹاپ، کوٹ۔ یہ کمرہ اپنے مکین کے اندرونی خلفشار کی داستان سنا رہا تھا۔ لڑکی چند لمحے چوکھٹ پر جمی کھڑی رہی پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر کمرے کی دائیں طرف رکھی لکڑی کی میز کی طرف دیکھا جہاں ایک فانوس جل رہا تھا۔ فرش پر جابجا کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ لکڑی کے بھورے فرش پر اسکے سفید جوتے واضح نظر آرہے تھے۔ وہ کتنے ہی پل وہیں کھڑی اس کمرے کا جائزہ لیتی رہی اسے وقت کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ کمرے سے ملحقہ غسل خانے سے پانی کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید کوئی اندر تھا۔ وہ چند پل یونہی کھڑی رہی پھر کہنی پر ٹنگا سفید پرس پلنگ پر رکھا، بوٹ سے بے ترتیب قالین درست کیا پھر چند قدم آگے بڑھ کر اس نے فرش پر گرے مڑے تڑے صفحات میں سے ایک صفحہ اٹھایا اور اسے کھولا۔

بھورے کاغذ پر سیاہ روشنائی سے انگریزی میں ایک تحریر درج تھی۔ کسی کہانی کا کوئی منظر، کوئی ٹکڑا۔ نوارد ایک قاری تھی اور قاری لکھا ہوا چھوڑ دے؟ ناممکن۔ اس نے زیرلب لکھا ہوا پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا کہ۔۔۔۔۔

وہ بلیک آؤٹ کی رات تھی۔ بلیک آؤٹ یعنی روشنی کا ہر منبع اس رات سرد اور تاریک تھا۔ عمارات غیر روشن، گھروں کے چراغ گُل، بتیاں بجھ چکیں۔ یا کسی سازش کے تحت بجھائی گئیں؟

اگر آسمان پر چمکتے ہلال کی بغیر ثقل والی زمین پر ہواؤں میں تیرتے ہوئے کُرہ ارض کی طرف نگاہ ڈالو تو ساری زمین روشن تھی بس ایک خطہ تھا جو تاریک تھا۔ سیاہ، جہاں محض اندھیرا تھا۔ وہ خطہ اس رات بلیک آؤٹ کا شکار تھا۔ وہ خطہ پاکستان تھا۔ سارے میں اندھیرا محض اندھیرا، اور اندھیرے میں دنیا کیا کرتی ہے؟

گناہ، گمراہ، جرم، قتل۔

اسی تاریک اور سرد رات میں کوئی وجود تھا جو گلیوں میں پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ اسکا تنفس پھولا ہوا تھا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے، سانس بھاری تھا۔ اور آنکھوں میں دہشت رقم تھی۔ سیاہ رنگ کے چغے سے اسکی آنکھیں بمشکل اپنا منظر دیکھ پا رہی تھیں۔ مگر وہ وجود جیسے بس دوڑنا جانتا ہو۔ فروری کی اس تاریک رات میں، خوف و ہراس سے بھاگتے ہوئے اسکا سارا بدن پسینے میں ڈوب رہا تھا، مگر اسے بھاگنا تھا۔ دور کہیں بہت دور تک۔ جہاں کوئی بھی اسکے جرائم کا پیچھا کرتے ہوئے اس تک پہنچ نہ سکے۔

گلی کے دہانے پر رک کر اس نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے اور جھک کر گہری لمبی سانسیں لیں۔ اسے سانس نہیں آ رہی تھی۔ سردی سے اسکا سارا جسم اکڑ رہا تھا۔ اسکی ہراساں نگاہیں آس پاس کچھ تلاش کر رہی تھیں، کیا؟ اسے خود بھی علم نہیں تھا۔ اسی لمحے کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس کی تیز روشنی اسکے وجود پر پڑی تو اسکا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ روشنی میں اسکا سیاہ چغہ دکھائی دے رہا تھا، اسکی ہراساں آنکھیں بھی مگر اس نے جو چھپانا چاہا وہ سینے پر لگا خشک ہو چکا خون تھا، پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کو اگر گیلا ہونا چاہیے تھا وہ قرمزی سیال سے گیلے تھے۔ قتل، اس نے ایک قتل کیا تھا اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"آگے کچھ نہیں لکھا۔"

بھاری مردانہ آواز پر کاغذ اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ ایک لمحے کو وہ باقاعدہ بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ گیلے بالوں والا وہ مرد آگے آیا کاغذ اٹھا کر میز پھر واپس رکھا اور خود پلنگ کے دہانے پر آ کر بیٹھا۔ لڑکی اب بھی کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ ساکن، بے سانس۔

"یہ کیا تھا؟"

"یہ کلائمکس تھا شروعات بہت مختلف تھی۔" اس نے بے حد سکون سے جواب دیا۔

"مجھے شروعات جاننی ہے۔" اس نے بے دیر بعد بے حد ہمت کے ساتھ کہا تھا۔ مرد نے اسے توصیفی نگاہوں سے

دیکھا۔ وہ بے حد پر سکون اور سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے سب سوچ کر آیا ہو۔

"اس کہانی کی ایک شرط ہے۔"

"منظور ہے۔"

"تمھیں چاہیے کہ پہلے شرط سن لو۔" مرد نے تنبیہہ کی۔ شاید وہ اسے بچانا چاہ رہا تھا۔ مگر کس چیز سے؟

"زیادہ سے زیادہ کیا؟"

مرد نے سر ہلایا۔ ایسے جیسے کسی سوچ میں ہو۔ "تم پارسائی کھو دو گی، اور اس کہانی کے بعد تم لوگوں پر کبھی اعتبار نہیں کر سکو گی۔"

لڑکی کی آنکھوں میں کوئی عجیب سی چمک ابھری۔ "پارسائی اور لوگوں پر یقین؟ میں پیدائشی طور پر ان دونوں چیزوں سے محروم ہوں۔"

مرد کچھ دیر کھوجتی نگاہوں سے اسے تکتا رہا۔ پھر جیسے اس نے فیصلہ کر لیا ہو۔

"ٹھیک ہے، پھر شروع کرتے ہیں۔"۔ زرد روشنی میں ڈوبے کمرے میں واحد آواز ان دونوں کے سانس لینے کی تھی۔ مگر اگلے ہی پل مرد کی بھاری مگر، دلسوز آواز اس کمرے کی دیواروں سے ٹکرائی۔

"کہانی کا پہلا حصہ بھرم ہے۔"

نوارد مرد اور کمرے کے وسط میں منجمند عورت کے ساتھ ایک نئی داستان کا قصہ شروع ہوا چاہتا ہے۔

★★★★★★★★★★★

برف کی تہوں کو چیرتی، کہیں کسی مقام پر ایک پل کو بھی نہ رکتی ہوئی سیاہ ہیوی بائیک مری سے اسلام جانے والی

اس سڑک پر پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔اسے چلانے والے کا چہرہ ہیلمٹ میں ڈھکا تھا۔ سرد ہوا کے تھپیڑے اس پر بے اثر تھے۔ دستانے میں ڈھکے ہاتھ مضبوطی سے ہینڈلز پر جمے تھے۔وہ بعض دفع دونوں ہاتھ سردی کے باعث سینے پر باندھ کر گرم کرتا اور بائیک چلتی رہتی شاید وہ اس کام میں ماہر تھا۔ اسلام آباد کے مضافات میں داخل ہوتے ہی جیسے اس بائیک کو پَر لگ گئے۔ رفتار اتنی تیز ہو گئی جیسے بہتی ہوائیں۔

رات کے گیارہ سے بارہ بجے کا وقت تھا جب ایک مصروف سی شاہراہ پر بائیک روکتے ہوئے وہ ہیلمٹ سمیت سڑک کنارے بنی ایک عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں دو گارڈز کھڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔باہر اجلی بتیاں روشن تھیں۔وہ آس پاس دیکھے بغیر عمارت کی طرف آیا۔روشنیوں میں اسکا سراپا ہلکا سا واضح تھا۔مضبوط جسامت اور بلند قد کاٹھ کا حامل وہ کوئی نوجوان تھا۔

"پاس کارڈ؟" داخلی دروازے پر اسے روک کر پوچھا گیا۔لڑکے نے ہیلمٹ اتارا، ہیلمٹ اترنے سے اسکے اسکے سیاہ بال ماتھے پر بکھر گئے۔اور چہرہ دکھائی دیا۔عامیانہ نقوش جو کہ تنے ہوئے تھے۔ماتھے پر بل تھے۔

"نہیں ہے۔" دو لفظی جواب۔

"پاس کارڈ نہیں ہے تو داخلہ نہیں تو اندر داخلہ ممنوع ہے دروازے کے باہر معمور محافظ نے اس سے

نوجوان نے ان دونوں سے کچھ نہیں کہا بس اپنی جگہ کھڑے کھڑے موبائل نکالا اور ڈائلز میں سے سب سے پہلے نمبر کو ایک کال ملائی۔ دوسری طرف گھنٹی جاتی رہی۔ کئی لمحے بیتے، پھر کال اٹینڈ ہو گئی۔

"اپنے دربانوں سے کہو میرا راستہ نہ روکا کریں۔ یا پھر مجھے ایسی جگہ نہ بلایا کرو جہاں مجھے روکا جائے۔" چھوٹتے ہی سرد مہری سے کہا۔ دوسری جانب کچھ لمحے کی خاموشی آئی۔ پھر اس نے بغیر کچھ کہے کال کاٹ دی۔

"سر آپ یہاں سے ہٹ جائیں ہمارے باس نے دیکھ لیا تو بہت بُرا ہو گا۔" محافظین میں سے کسی نے کہا۔ ہیلمٹ

ہاتھ میں لیے کھڑے لڑکے نے تندہی سے اسے دیکھا۔"آپ ایک طرف ہو کر انتظار کرلیں۔"

"دو منٹ رک جاؤ اگر دو منٹ کے اندر اندر مجھے اندر بھیجنے کے احکامات نہ آئے تو ہٹ جاؤں گا میرے یہاں کھڑے ہونے سے زمین سکڑ نہیں جائے گی۔"اسکا انداز دوٹوک اور بے زار بیک وقت تھا۔

"کیوں تم کہیں کے راجہ لگے ہو جو تمھیں بلالیں گے؟"دوسرے محافظ نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔اسکا لباس،جوتے،خوشبو اور انداز وہ کہیں سے بھی امراء کاشناسا نہیں لگتا تھا لہٰذا اس سے زبان چلا کر انکا کوئی نقصان ہونا تو نہیں تھا۔

ابھی وہ کوئی جواب دیتا کہ محافظ کا موبائل تھرتھرایا۔لڑکے کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔جس میں طنز کی ہلکی سی رمق بھی تھی۔گارڈ نے کال اٹینڈ کی اس کے بھدے موبائل سے آواز اس نوجوان کے کانوں تک آ رہی تھی۔

"کسے روک کر رکھا ہے تم نے؟"دوسری طرف موسیقی اور ہلچل کے شور کے درمیان ایک مردانہ آواز ابھری۔"تم ایسے کیسے میرے مہمانوں کو روک رہے ہو؟میں نے تم سے کہا تھا ناں اس کو مت روکنا۔"

"صاحب وہ...."محافظ ہکلایا پھر لڑکے کی طرف دیکھا۔موبائل پر ہاتھ دے کر وہ اب مدھم لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔"آپ کا نام؟"

لڑکا چند پل اسے تکتا رہا پھر دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"اسلان شجاع یمن۔"

"سر کوئی اسلان یمن صاحب ہیں۔اندر جانے دوں؟"

"آنے دو۔"دوسری طرف سے حکم آیا اور کال بند ہوگئی۔محافظوں میں سے ایک اب اسلان یمن کو اندر جانے

کے لیے کہہ رہا تھا۔ایک متذبذب تھا کہ تلاشی لے کہ نہ لے؟یہ نہ ہو کہ اس کا صاحب پھر ناراض ہو جائے۔چند پل بعد وہ عمارت کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ایک لمبی سی راہ داری تھی جس کے دونوں اطراف نیلی بتیاں جل رہی تھیں۔موسیقی کا بے ہنگم شور اسکے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح برسنے لگا۔راہ داری کے اختتام پر بڑا سا ہال تھا جہاں جلتی بجھتی،رنگ بدلتی بتیاں اور ناچتے تھرکتے نوجوانوں سے بے نیاز وہ رش میں اپنا راستہ بناتا ہوا ایک طرف کو جا رہا تھا۔کسی نے اسکے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا اور دو سا شے دکھائے،شاید منشیات کی کوئی نئی قسم۔اس نے کوفت سے اسے پرے ہٹایا۔

کوئی جھومتی گاتی لڑکی اسکے ساتھ رقص کی خواہش رکھتی آگے آئی،اس کے سینے پر ایک ادا سے ہاتھ رکھا تو وہ اسے بھی جھٹک کر آگے بڑھا۔چبوترے پر کھڑے ناچتے لوگوں سے ذرا فاصلے پر بنے ایک نجی کمرے میں داخل ہوتے اس نے سامنے دیکھا تو وہی منظر تھا جو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔جو ہر بار کی طرح آج بھی اپنا اثر کھو چکا تھا۔

گہرے شوخ رنگ کے لباس پہنے،گلے میں زنجیریں اور مالائیں ڈالے ہوئے کئی لڑکے اور لڑکیاں وہاں موجود تھے۔شراب اور منشیات کی زیادتی سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔بدن لڑکھڑا رہے تھے۔شراب کی بو نتھنوں میں داخل ہو رہی تھی اسلان یمن چوکھٹ پر کھڑا رہا یہاں تک کہ ان میں سے ایک کا دھیان اسکی طرف پڑا۔اور وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔

"ارے ارے ذرا دیکھو تو کون آئے ہیں۔"صوفے پر پھیل کر بیٹھا،شراب کا گلاس ہاتھوں میں لیے ہوئے شاید وہ ان سب کا آقا تھا۔"آنے میں کوئی تکلف تو نہیں ہوا ناں؟"اسکے گھٹنے پر پستول رکھی تھی۔میز پر تیز دھار چاقو یقیناً شرافت سے اسکا کوئی تعلق نہیں تھا۔

"یہاں کیوں بلوایا؟ڈیلوری تمہارا کام ہے میرا نہیں۔"وہ بے تاثر لہجے میں پوچھ رہا تھا۔گردن ہنوز اکڑی ہوئی تھی۔چہرے پر بے زاری اور ماتھے پر بل تھے جو اسکی کشش میں اضافہ کر رہے تھے۔

"آپ کی امانت آپ تک پہنچانی تھی،اب ہم تو مری آنے سے رہے آپ کے افسر چچا دھر لیں گے ناں۔"وہ کچھ

کچھ طنز سے کہہ رہا تھا۔ اسلان کے اکھڑ تاثرات ویسے ہی رہے۔ ”ڈیلوری با قاعدہ ہماری ذمّہ داری ہے لیکن پکڑے جانا کون چاہے گا؟“

”میر اسامان؟“ اس نے سختی سے استفسار کیا۔

”ابھی دے دیتے ہیں۔“ باس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا وہ تیزی سے اٹھے اور صوفوں کے عقب سے ایک سفید رنگ کا بستہ لے کر آئے۔ میز پر رکھ کر اسے کھولا اور اسلان نے بس اپنے ”سامان“ کی جھلک دیکھی پھر زپ چڑھائی گئی اور بستہ اسکے حوالے کیا گیا۔ جسے وہ تھام گیا۔

”کچھ پینا چاہو گے؟“ میز پر قطار در قطار رکھی بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے باس نے اسے پیشکش کی۔ ”ابھی رات جوان ہے جانے کی اتنی بھی کیا جلدی ہے؟“

”میں پیتا نہیں ہوں۔“ بستہ اٹھا کر کسی ناپسندیدہ شے کی طرح کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ شراب، خوبصورت لڑکیاں، منشیات وہ ہر شے سے بے زار جیسے آیا تھا ویسے ہی باہر نکل گیا۔ باہر وہی شراب اور افیم کی ناگوار بو اور وہی دنیا و مافیہا سے بے خبر نوجوان تھے۔ اسلان کا موبائل تھرتھرایا۔ شور کے باعث وہ رنگ ٹون تو نہیں سن سکا البتہ تھرتھراہٹ پہچان گیا تھا۔ عمارت سے باہر آ کر بستہ دونوں بازوؤں سے سینے تک لا کر اس نے موبائل جینز کی جیب سے نکال کر کان سے لگایا۔

”بکو.....“ اکتاہٹ سے کہا۔

سامنے سے اگر کوئی خوشگوار انداز سے کچھ کہنے لگا تھا تو اسکا سارا مزاج اکارت ہو گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی شاید وہ اسلان کی بدتمیزی ضبط کرنا چاہ رہا تھا۔ جو کہ ہر دفعہ کی طرح مشکل امر تھا۔

”اس ماہ کی پانچ تاریخ آخری تھی تم نے اب تک کام مکمل نہیں کیا؟“

اسلان کی گرفت ہیلمٹ پر مضبوط ہوئی۔ بازوؤں کی رگیں پھول گئیں اور کنپٹی کی رگ جیسے پھڑک رہی ہو۔ اسکی

آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے تھے۔"تم پیسہ دے کر مجھے خرید نہیں سکتے۔میں تمہارا غلام نہیں ہوں۔"

"بالکل تم میرے غلام نہیں ہو لیکن شاید تم وہ دو قتل....."وہ جو کوئی بھی تھا اسے اسلان کی دُکھتی رگ کا علم تھا۔

"اپنی بکواس بند کرو۔"اسلان چبا چبا کر اسکی بات کاٹ گیا۔سانسیں غیر ہموار ہو گئیں۔دسمبر کی سرد رات میں بھی اسکے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہوئے۔"اس سب میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔"

"بالکل۔"سامنے والے نے ٹھنڈے لہجے میں اسکی تائید کی۔"لیکن جو میں کروں گا اس میں سارا قصور تمہارا ہو گا۔بہتر ہے کہ تم وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں،ورنہ نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

وہ اسلام آباد کی اس سڑک پر چند لمحے جمود کا شکار رہا۔دکانوں کے گرے ہوئے شٹرز اور اجلی روشنیوں میں موبائل کان سے لگائے وہ کتنے ہی لمحے خاموش رہا۔کندھے ڈھیلے پڑ گئے،ماتھے کے بل غائب ہوئے۔اب وہاں کوئی انجانا خوف تھا۔

"میں اسے نہیں ماروں گا۔"بلاخر اس نے فیصلہ کر لیا۔کندھوں سے ہر بوجھ سرک گیا۔سوائے خوف کے۔"اگر مجھے لگا یہ ضروری ہے تب.....میں تم سے اجازت نامہ لینے نہیں آؤں گا لیکن تمھارے کہنے پر میں اسے نہیں ماروں گا۔جو تمھارے اشاروں پر ناچے وہ انسان کوئی اور ہو گا۔"

دوسری طرف کوئی بھی جواب سنے بغیر اس نے موبائل بند کیا۔دل تیز رفتار سے دھڑک رہا تھا۔اس نے موبائل جینز کی جیب میں ڈال دیا۔ہیلمٹ واپس چڑھایا تو چہرہ چھپ گیا اور بس اسکی گہری بھوری آنکھیں نظر آئیں۔کلائی پر بندھی گھڑی پر اس نے وقت دیکھا،ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔وہ جلد گھر پہنچ جائے گا اسے یقین تھا۔

دوسری طرف موجود انسان اس انکار پر اسکی زندگی تباہ کر سکتا تھا اسے یہ بھی یقین تھا۔مگر وہ نہیں مارے گا،ہر گز نہیں۔

★★★★★★★★★★★

شہر: کوہ مری

وقت: ادھ رات۔

سیاہ ستاروں سے خالی آسمان سے روئی کے سفید گولے تواتر سے زمین پر گرتے جا رہے تھے۔ درختوں نے سفید ی اوڑھ لی، عمارتیں جو سیاہ، سرمئی، سبز، نارنجی رنگ کی تھیں اب سفید دکھائی دے رہی تھیں۔ ہر طرف خاموشی اور سکون تھا۔ **ایسی** خاموش اور پر سرار رات میں اس وقت دور کہیں سے بس کُتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی تھیں۔ تاریکی ایسی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ برف نے سارے کوہ مری کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ گھروں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ یوں جیسے ہر گھر کا چراغ گُل ہوا ہو۔ کئی گھنٹوں سے جاری برف باری اس لمحے رک گئی تھی۔ آج وادی بجلی کی قلت کا سامنا کرنے پر مجبور تھی۔ کہیں کسی گھر سے کوئی مدھم زرد روشنی جلتی نظر آجاتی تو زندگی کا گمان ہوتا ورنہ کمبخت جاڑا ہڈیوں میں گھس کر اعضاء جامد کر دینے کے درپے تھا۔

ایسے میں وادی کی ایک اپر مڈل کلاس کالونی کی طرف آؤ تو قطار میں بنے پکے خوب صورت مکان اپنی تمام تر شان کے ساتھ کھڑے تھے۔ برف نے انکی چوٹیوں کو سفید کر دیا تھا یوں اس کالونی کے سارے گھر پتھروں کے بنے تھے۔ مری کی ڈھلوانوں والی گلیاں اور پتھر کے مکان۔ جونیپر کے درخت اور کھلے صحن کسی بھی سیاح کا قیام اس وادی میں بڑھا سکتے ہیں۔

کہانی بھی اسی کالونی کے ایک خوب صورت دو منزلہ بنگلے سے شروع ہوتی ہے، جہاں گھر کے باہر پولیس کی خاص نفری بھاری تعداد میں جمع تھی۔ گاڑیوں کے سائرن جاری تھے۔ بتیاں جل بجھ رہے تھے۔ زرد پٹیاں جن پر do not cross درج تھا گاڑی سے نکالی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر قبل جو کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تم نے سنی تھی ان کتوں کو اب دو اہلکار آدمی انکے لمبے پٹے سے کھینچ کر کھڑے تھے۔ وہ بو سونگھنے والے کتے تھے چیر پھاڑ کر محسوس کرنے والے، اور کبھی کبھی چیر پھاڑ دینے والے بھی۔ ہاتھوں میں ٹارچ لئے انکے پیچھے چلتے اہلکار ان کتوں کے لئے

روشنی کا زریعہ تھے۔

وادی کا یہ محلہ انجانے خوف میں گھر چکا تھا۔ بنگلے کا جنگلہ پار کرتے ہوئے اندر آؤ تو یہاں پولیس والوں کا ایک

درجن بھر موجود تھا۔ کوئی یہاں ٹارچ لگا کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا، تو کوئی وہاں۔ گھر کے اندر تک جانے کے لئے ایک پتھریلی روش تھی۔ جس کے دونوں اطراف میں سبز گھاس۔ پتھریلی روش کے عین بیچ و بیچ ایک آدمی پڑا تھا۔ ساکت، بے جان۔ ختم۔ اسکے گرد چاک کے نشان لگے ہوئے تھے۔

اسے مرے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ بیت چکا تھا۔ گولی عین اسکے ماتھے پر لگی تھی رات کی تاریکی میں وہ تم کو نظر نہیں آئے گی، لیکن وہ تھی جو کہ دماغ کو پھاڑ کر خون کے ساتھ کچھ دماغ کا حصہ بھی نکال کر دوسری جانب سے سالم نکل آئی تھی یہ لوہے کا زرہ بھی کیسی چیز تھا انسان کو چیر دیتا تھا اور خود سلامت رہتا تھا۔ اسکی آنکھیں کھلی تھیں۔ شاید بے یقینی سی تھی۔

لاش کے پاس ایک آدمی پنجوں کے بل بیٹھا تھا۔ جہاں خون جم چکا تھا اس سے محض ایک انچ کے فاصلے پر۔ اسکے لمبے بوٹ روش کے پاس گری برف میں دھنسے ہوئے تھے۔ وہ پولیس کی وردی میں نہیں تھا اس نے بس سیاہ سوئیٹر کے اوپر اوور کوٹ پہن رکھا تھا ہاتھوں میں دستانے، اور ایک ہاتھ میں ٹارچ پکڑے وہ سردی سے نیلی پڑ چکی لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ آنکھیں، منہ، گردن، اس نے لباس کے باہر نظر آتے سارے جسم کا معائنہ کیا۔

اسی لمحے سارا گھر روشن ہوا تھا شاید کسی نے مین جنریٹر چلا دیا تھا۔ اسی روشنی میں وہ پنجوں کے بل بیٹھا آدمی نظر آیا تھا۔ اسکا جسم مضبوط اور کندھے چوڑے تھے۔ بھوری نگاہیں زیرک، اور پرسکون۔

دستانہ پہنے ہاتھوں سے وہ لاش کی کھلی آنکھوں کو اپنی انگلیوں کی مدد سے مزید کھول کر دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں سرد اور خالی تھیں۔ تاثر بے پرواہ۔ چند لمحے زخم دیکھتے رہنے کے بعد دفتعاً وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا، ساتھ چند لوگوں کو اشارہ کیا وہ اب لاش کو اٹھا رہے تھے۔ سفید اوور کوٹ والا آدمی اب بنگلے کے پچھلے حصے کی جانب جا رہا تھا۔ اسکے

ساتھ مقتول کا بھائی بھی تھا، جو بار بار اپنی نم ہوتی آنکھوں کو رگڑ رہا تھا۔ بنگلے کے عقبی حصے میں بھی ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ بالکل ویسا جیسا داخلی حصے میں۔ لان کے دائیں طرف چھوٹا سا لوہے کا دروازہ تھا جو شاید کئی سالوں سے بند تھا بھوری آنکھوں والا مرد غور سے اب اس دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر قدم قدم چلتا وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ چونکہ برف باری تھم چکی تھی اس لئے اسکے پیروں کے نشان بنتے جا رہے تھے، مٹ نہیں رہے تھے اب وہ غور سے دستانہ پہنے ہاتھوں سے دروازے پر لگے تالے کو ٹٹول رہا تھا ایسے جیسے پوچھ رہا ہو قاتل کون؟ تالا ہلکا سا چکنا تھا اسکا سوراخ بھی چکنا تھا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں تیل ڈالا گیا ہو۔ سفید اوور کوٹ والے آدمی نے مڑ کر سامنے کھڑے مقتول کے بھائی کو دیکھا۔ تیس پینتیس برس کا خوش شکل احد خان۔ جس کی آنکھیں سرخ نظر آ رہی تھیں۔ اور چہرے پر ملال تھا۔

”تو آپ کہہ رہے تھے کہ چور آپ کے گھر میں داخلی دروازے سے داخل ہوئے؟“ وہ اب احد کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا اسکا لہجہ بھاری تھا۔ بارعب اور مرعوبیت طاری کرنے والا۔

اس نے نیچے جھک کر ایک بھاری پتھر اٹھایا۔ ”کیا آپ سارا قصہ دوبارہ سنا سکتے ہیں؟“ اس نے پتھر سے تالہ ایک ہی ضرب میں توڑتے اور پتھر ایک طرف اچھالتے ہوئے پوچھا۔

احد نے اپنی نم آنکھیں ایک بار پھر رگڑ کر صاف کیں، اور کئی بار سنایا جانے والا قصہ ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔

”ہم لوگ آج جلدی سو گئے تھے لیکن پھر کچھ دیر بعد شور سے میری آنکھ کھل گئی۔“ اوور کوٹ والا افسر چھوٹے سے دروازے سے باہر گلی میں نکل آیا۔ احد اسکے پیچھے ہی تھا۔ ”جب میں اٹھا تو میں نے دیکھا کہ تین چار لوگ بندوقوں کے ساتھ ہمارے گھر میں داخل ہو رہے ہیں، انہوں نے چوکیدار کو بھی مار گرایا تھا۔ آپ نے چوکیدار کو دیکھا ناں؟“ اس نے تائید چاہی تھی۔

مرد نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ احد نے کہنا جاری رکھا۔

"میرا بھائی....." وہ سوگواری ایک مرتبہ پھر طاری ہونے لگی، آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔ "میرے بھائی کو رات میں باہر بیٹھ کر کام کرنے کی عادت تھی۔ یا پھر وہ لان میں ٹہلتا رہتا تھا۔ وہ آج بھی لان میں بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا، جب ڈاکو اندر داخل ہوئے۔ میرے بھائی نے انکو روکنے کی کوشش کی، لیکن وہ شاید پکڑے جانے کے خوف میں تھے اور۔۔۔۔۔۔۔۔" پھر وہ رکا گلا رندھ گیا۔ "اور پھر اسی مزاحمت میں انہوں نے میرے بھائی کو مار ڈالا۔ انہوں نے مار ڈالا۔" وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ افسر پر کوفت طاری ہونے لگی تھی۔ وہ اب دوبارہ سے پنجوں کے بل زمین پر بیٹھا۔ بوٹوں کی سطح اب بھی برف کو چھو رہی تھی۔ وہاں کچھ نشان تھے، بھاری بوٹوں کے یہاں سے گزر جانے کے نشان۔ ثابت واضح نشان۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔ چھوٹے سے دروازے کے اوپر ایک چھجا بنا تھا اور یہ نشان چھجے کے عین نیچے، یعنی برف باری ان نشانات کو نہیں مٹا سکی کیونکہ یہاں برف ٹھیک سے گری ہی نہیں۔

سٹریٹ پولز کی روشنی میں اس نے احد کے جوتوں کو دیکھا اس نے سفید جاگرز پہن رکھے تھے۔ بے داغ کورے، لیکن....

"آپ کے جوتے بہت اچھے ہیں۔" زمین پر پنجوں کے بل بیٹھے اس نے ٹھنڈے انداز میں ستائش سے کہا تھا۔ احد کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا تھا۔ چہرے پر یکدم سختی در آئی۔

"انسپکٹر سہراب یمن!" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔ "بہتر ہو گا آپ وہ کام کریں جس کے لئے یہاں لائے گئے ہیں میرے جوتوں سے زیادہ میرے بھائی کی لاش اہم ہے۔" وہ جتاتے ہوئے کہتا آگے بڑھ گیا۔ سہراب نامی افسر ہاتھ جھاڑ کر اٹھتا اسکے پیچھے گیا تھا۔ اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسکی نگاہیں پر سکون ہو گئیں۔ ایسے جیسے کوئی اہم ثبوت ہاتھ لگا ہو۔

کچھ دیر بعد لاؤنج میں رکھے سفید رنگ کے مخملی صوفوں میں سے ایک پر سہراب بیٹھا تھا۔ اسکے سامنے احد اور اسکی بیوی بیٹھے تھے۔ تیسرے صوفے مقتول فہد کا بوڑھا لاغر باپ، اسکے ساتھ ہی فہد کا چار سالہ بیٹا اور فہد کی بیوہ بیٹھی

تھی۔ جواب تک بے یقین تھی۔

سہراب گہری نظروں سے انکا جائزہ لے رہا تھا۔ آس پاس تلاشی اور کاروائی جاری تھی۔ دفعتاً اس نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دی وہ دوڑتا ہوا چلا آیا۔ سہراب نے اسکے کان میں کچھ کہا۔ ساتھی نے سر ہلا دیا۔ اور جب کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اسکے ہاتھ میں پانی کی دو بالٹیاں تھیں۔ اسکے پیچھے ایک تیسرا آدمی بھی تھا اسکے ہاتھ میں بھی اسی طرح کی بالٹیاں تھیں پانی سے لبالب بھری ہوئی۔

احد نے اچھنبے سے پہلے ان بالٹیوں کو دیکھا تھا۔ اور پھر صوفے پر آگے کو ہو کر بیٹھے سہراب کو اسکی سانولی رنگت اور عام نقوش بھی اس وقت گہرے اور پر اسرار لگتے تھے۔

"آپ سب ان بالٹیوں میں اپنے ہاتھوں کو دھوئیں گے، یہ تفتیش کا حصہ ہے اور پلیز تعاون کیجیئے گا۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "ورنہ مجھے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں جو کہ میں اس وقت آزمانا نہیں چاہتا۔" سہراب ایک ہاتھ میں بالٹی اٹھا کر سب سے پہلے بوڑھے باپ کی طرف آیا تھا۔

"پلیز تعاون کریں، نقیب صاحب۔" اس نے نرمی سے انکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ بوڑھا نقیب اپنے لاغر وجود کے ساتھ ہلکا سا جھکا، زمین پر پڑی بالٹی میں اپنے دونوں ہاتھوں کو ڈبویا اور پھر ذرا سا رگڑ کر باہر نکال لیا۔ اسکی آنکھوں سے بے آواز آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔ جوان موتیں بہت بری ہوتی ہیں۔

خاتون اہلکار اب فہد کی بت بنی بیٹھی بیوی کے ہاتھ دھلوا رہی تھی۔ پانی کورا صاف تھا اس نے احد کی بیوی کے ہاتھ دھلوائے، پانی اب بھی صاف تھا۔ البتہ وہ ذرا غیر آرام دہ ہوئی تھی۔ اب کے سہراب یمن نے بالٹی احد کے آگے رکھی، اور خود سامنے رکھی میز پر بیٹھ گیا۔ اسکی آنکھیں سخت تھیں۔ جسم کے آر پار سے گزرتی ہوئی۔ افسر اور مقتول کے وارث کے درمیان ان دیکھی جارحیت تھی۔ احد کے گلے میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ چار و نہ چار اس نے بالٹی میں ہاتھ ڈالے۔ ہلکا گرم پانی اس سردی میں بھلا لگا۔ اس نے ہاتھوں کو اچھی طرح پانی کے اندر

رگڑا، اور پھر باہر نکالا۔

سہراب نے جھک کر بالٹی میں پڑا پانی دیکھا۔یوں لگا جیسے وہ مسکرایا ہو۔پانی کورا صاف نہیں تھا۔وہ میلا بھی نہیں تھا۔اسکے اوپر بس ہلکی سی، بہت ہلکی سی چکنائی کی پرت تھی۔اب جھک کر احد کے کورے سفید جوتے دیکھو تو ان پر تیل کے تین بس تین ہی چھوٹے چھوٹے دھبے تھے۔سہراب اپنی جگہ سے اٹھا اور مڑ کر اپنے ساتھ کھڑے اہلکاروں کو اشارہ کیا۔

"احد خان کو گرفتار کرلو یہ قاتلوں کا تعاون کار ہے۔" وہ کہتے ہوئے اپنے اوور کوٹ سے نادیدہ گرد جھاڑتا ایک بھی نگاہ غلط کسی پر ڈالے بغیر باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

پیچھے تین چار اہلکار احد کو ہتھکڑی پہنا رہے تھے۔اسکی کی بیوی چیخ رہی تھی، رو رہی تھی بوڑھا نقیب اب کے بے بسی کے آنسو بہا رہا تھا ایک بیٹا جائیداد کی خاطر قتل ہو گیا۔اور دوسرا جائیداد کی خاطر قاتل بن گیا تھا۔کوہ مری کا یہ بنگلہ اس وقت گہری تباہی کا مرکز تھا۔

رات کی تاریکی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی چلی گئی۔سفیدی اس شخص کے ساتھ ہی رخصتی کا عندیہ دے گئی تھی۔

★★★★★★★★

"شہر لاہور"

"جنے لہور نئیں ویکھیا او جمیا ای نئیں"

جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔مشہور مقولہ سچ پر مبنی ہے۔لاہور مختلف ثقافتوں کا گڑھ ہے۔تہذیبوں کی آمجگاہ اور درس و تدریس کا مسکن۔لاہور شہر نہیں دنیا ہے۔ادب، موسیقی، کھیل، شوبز، علم، سیاست، گلیمر، رئیسی اور صدیوں قبل بنے ہوئے محلوں کا امین۔ہزاروں

برس پہلے جب بادشاہ اس سرزمین کی اور آئے تھے تب سے لے کر اب تک لاہور نے تاریخ کو محفوظ کرلیا تھا۔

جہاں لاہور جدت کو سینے سے لگائے آگے بڑھ رہا ہے وہیں اس شہر نے اپنا قدیم حصہ بھی ماتھے پر چسپاں کر رکھا ہے۔ پرانا لاہور اور اسکی تنگ و تاریک گلیاں، نیا لاہور اور اسکی جدید سڑکیں، عالیشان عمارتیں غرض کہ لاہور

دلوں میں گھر کرنا جانتا ہے۔

رات کے اس پہر شہر کے ایک پوش حصے میں اونچے عالیشان مکانات کے درمیان "آشیانہ بنگش" اپنی تمام تر شان سمیٹے غرور سے گردن اٹھائے کھڑا تھا۔ آشیانہ بنگش اپنے گرد و پیش کے تمام گھروں سے مختلف نظر آتا تھا وجہ؟ وجہ وہ جدید و قدیم کا امتزاج تھا۔ سرمئی دیواریں کسی محفوظ قلعے کا پتا دیتی تھیں تو دیواروں کے پار چاروں طرف بچھی گھاس کے قالین کے عین بیچوں بیچ سیاہ رنگ کی وہ جدید طرز پر بنی عمارت کھڑی تھی جسے دیکھنے والے ایک مرتبہ ٹھٹھکتے ضرور تھے۔

ایسا کورا سیاہ رنگ تم نے محض سیاہ رات کا دیکھا ہوگا۔ دیوار گیر شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیوں سے اندر جلتی سفید بتیوں کا منظر پر سرار اور مرعوبیت کا تاثر دے رہا تھا۔ سارا گھر لتاڑ کر سلائیڈنگ ڈور ہاتھ لگا کر کھولتے ہوئے، چھتوں کی سیلنگ پر بنے کوئی نفیس ڈیزائن کو حیرت سے تکتے مدھم، باریک آوازوں پر کان دھرتے گھر کے لاؤنج میں قدم رکھو تو وہاں چند لوگ بیٹھے دکھائی دیں گے پر تعیش قیمتی سجاوٹی نمونوں سے بھرا ہوا شاہانہ طرز کے صوفے اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیوں والا لاونج۔ اس وقت ان صوفوں پر تین لوگ براجمان تھے۔

"شاہ زید کتنی دیر ہو گئی ہے پروگرام کب شائع ہو گا؟"

صوفے پر غیر آرام دہ انداز میں بیٹھی کوئی ادھیڑ عمر عورت جھنجھلاہٹ سے کہہ رہی تھی۔ وہ کافی تندرست، اور ڈھلتی عمر کے باوجود پر کشش لگ رہی تھی۔ انگوٹھیوں والے ہاتھ باہم ملائے وہ پر جوش نظر آرہی تھی۔

"مام نیٹ فلکس پر آرہا ہے آپ کا بیٹا، اتنی کامیابی کے لیے اتنا انتظار تو بنتا ہے۔"

فرشی کشن پر بیٹھا ٹراؤزر اور ٹی شرٹ والا لڑکا رسان سے کہہ رہا تھا۔لاؤنج میں عجیب سا اضطراب اور جوش بھرا ہوا تھا ایسا ہر دفع ہوتا تھا جب جب "شاہ ویر بنگش" کو سکرین کے چوکھٹے میں نمودار ہونا ہوتا تھا۔ گو کہ یہ پہلی بار نہیں تھا لیکن جوش کا یہ عالم ادھیڑ عمر اداکارہ پر ہر دفع یونہی طاری ہوتا تھا۔

"مام قریشی صاحب سے بات ہوئی آپ کی؟" یہ آواز لاؤنج کے نسبتاً کونے والے اکلوتے صوفے پر بیٹھے آدمی کی تھی۔وہ اس جوش سے یکسر بے نیاز تھا۔چہرہ موبائل پر جھکا رکھا تھا۔"آپ مل لیں مجھے انکا کام اچھا لگا ہے۔کہانی تھوڑی دقیانوسی ہے لیکن پاکستان میں یہی بِکتا ہے۔"

عورت کا چہرہ پل بھر میں سخت ہوا۔جوش برطرف ہوا اور تاثرات میں ناگواری گھلی۔"رئیس میرا خیال ہے اس وقت کاروبار سے زیادہ اہم تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔"

رئیس نے سر اب بھی نہیں اٹھایا،موبائل پر انگلیاں چلاتے ہوئے وہ بے حد مصروف تھا۔وہ کچھ تصاویر "تمکنت بنگش" نامی عورت یعنی اپنی ماں کو ای میل کر رہا تھا۔اور تمکنت اب سر جھٹک کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

اسی لمحے نیٹ فلکس نے ایک نئے پروگرام کا پیغام دیا۔مخصوص آواز کے ساتھ سرخ ""N سکرین کے بیچ میں نمودار ہوا،تعاون کے شکریے،پروگرام کے ساتھیوں کے نام اور مختلف انتباع کو آگے بڑھاتے پروگرام شروع کرنے والا شاہ زید ہی تھا۔

ان تینوں کی نگاہیں اس وقت دیوار گیر ٹی وی پر مرکوز تھیں شاید انہیں کسی کا انتظار تھا اس گھر کے سب سے اہم فرد کے جلوہ گر ہونے کا انتظار اور پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ماں بنگش دھڑکتے دل کے ساتھ صوفے سے مزید آگے ہو کر بیٹھی۔اسکا بس نہیں چلتا تھا کہ ٹی وی کے عین سامنے جا کر کھڑی ہو جائے اسی لمحے ٹی وی پر ایک منظر ابھرا ایک انٹرویو دفتر کا منظر۔دو لوگ تھے جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے تھے۔درمیان میں

شیشے کی میز جس پر کافی کے کپ دھرے تھے۔

"کیا آپ اپنا تعارف کروائیں گے؟" ایک سیاہ فام امریکی عورت اپنے سامنے صوفے پر بیٹھے پاکستانی لڑکے سے کہہ رہی تھی۔

"آپ کروائیں، میں سننا پسند کروں گا۔" وہ جواباً مسکراتے ہوئے بولا۔

شاہ زید بھی ہولے سے مسکرایا۔ وہ دونوں جڑواں تھے ایک دوسرے سے بے حد مختلف مگر پھر بھی ایک۔ ٹی وی کے چوکھٹے میں نظر آتا لڑکا زیادہ پر اعتماد زیادہ روشنیوں میں گھرا اور زیادہ مقبول تھا۔ اب اسکا تعارف کروایا جارہا تھا۔ انٹرویو والی انگریز لڑکی مسکراتے ہوئے فخر سے اسکی شان میں کچھ قلمات کہہ رہی تھی۔

"آج ہم آپ کو ملوائیں گے ایک بہت ہی خاص انسان سے۔ چھبیس سال، صرف اور صرف چھبیس سال کی عمر میں جناب "شاہ ویر بنگش" نے اتنی کامیابی، اتنی شہرت، اور اتنی قدر سمیٹی ہے کہ اسے زندگی کے بقیہ تمام سالوں کے لیے کہیں محفوظ کر کے رکھا جائے تب بھی یہ خزانہ کم نہ ہو۔"

سفید رنگ کے ہائی نیک سوئیٹر کے ساتھ، سیاہ جیکٹ اور ہم رنگ پینٹ پہنے، بھورے بالوں کو جیل سے سمیٹ کر ایک طرف کیے وہ کیمرے کی آنکھ میں دیکھتے بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔ اسکے گلے میں ایک باریک سی سفید سونے کی زنجیر نظر آرہی تھی۔ پیروں میں برانڈڈ سفید بوٹ۔ اسکی گہری کتھئ آنکھیں بے حد چمکدار تھیں۔ اجلی رنگت پر سیاہ، سفید لباس کِھل رہا تھا۔

"شاہ ویر بنگش ایک ناولسٹ اور سکرین رائیٹر ہیں۔ پانچ سالہ رائٹنگ کیریئر میں انہوں نے اگر کچھ دیکھا ہے تو وہ "معجزہ" ہے۔ شاہ ویر کی لکھی پانچ کہانیوں میں سے تین پر اس وقت ہالی وڈ ویب سیریز بن چکی ہیں اور چوتھی کی شوٹنگ جاری ہے۔ جس کے سلسلے میں لکھاری صاحب آج کل کبھی لندن اور کبھی نیویارک میں مقیم ہیں۔"

لمبا چوڑا تعارف ختم ہوا تو میزبان نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ شاہ ویر کو دیکھا۔

”سو شاہ ویر کیسے ہیں آپ؟“ مسکراتے ہوئے پوچھا گیا۔

”میں خوب صورت ہوں۔“ اسکے برجستگی سے کہنے پر اسکی ماں فخر سے مسکرائی تھیں۔ شاہ ویر بھی مسکرایا۔

”میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ طبیعت کیسی ہے، مزاج کیسا ہے، حالات کیسے ہیں؟“ بیلا محظوظ ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ شاہ ویر سے اسکی اچھی خاصی دوستی تھی۔

”طبیعت اور مزاج کو میں خاطر میں نہیں لاتا، اور حالات کا مت پوچھو یہ بدلتے ہی رہتے ہیں۔“

”میں تم سے لفظوں کے معاملے میں نہیں جیت سکتی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا لیے۔

”کیونکہ تمھارے سامنے ایک لکھاری ہے۔“

شاہ ویر کی مسکراہٹ بدستور قائم تھی۔ اب کے اسکا بھائی بھی مسکرایا تھا۔ اداس مسکراہٹ۔ وہ کتنے دنوں سے مل نہیں سکے تھے، کتنے دن ہوئے اسکے ساتھ وقت گزارے، اور اب وہ اسے اس طرح ٹی وی پر دیکھ رہا تھا۔ وہ سامنے تھا لیکن فاصلہ سات سمندر کا تھا۔

سکرین پر نظر آتی بیلا اب کوئی اور سوال کر رہی تھی۔ ”آپ نے سولہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا، آج آپ چھبیس سال کے ہیں اور آپ کی کتابیں نیو یارک ٹائم کی بیسٹ سیلر کہلاتی ہیں۔ آپ کا سکرین پلے کمال ہے۔“ بیلا کہہ رہی تھی۔ اور شاہ ویر سر ہلاتے سنجیدگی سے اسے سن رہا تھا۔

”آج آپ اپنے ملک کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے لکھاریوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور عالمی سطح پر آپ کی کتابیں کتابیں سب سے زیادہ بکتی ہیں اور آپ تقریباً چھ فلموں کے لیے منظر بندی (cinematography) کر چکے ہیں کیا آپ کو خود پر فخر محسوس ہوتا ہے؟ کیا کبھی ایسا لگا کہ آپ سے بہتر کام کوئی نہیں کر سکتا؟“

شاہ ویر نے بیلا کو ایک نظر دیکھا۔ اپنی کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے ایک گھونٹ بھرا۔

”میری کتابیں جتنا بکتی ہیں، میرے سکرین پلے پر جتنے تبصرے ہوتے ہیں یا پھر میرے فالوورز جتنے بڑھتے ہیں ان سب کی وجہ سے میرے اندر مزید عاجزی بھر جاتی ہے۔ مجھے خود پر نہیں ان لوگوں پر فخر ہے جو مجھے پڑھتے ہیں میں اپنے لفظوں سے جو دنیا بناتا ہوں، میرے قارئین اس دنیا میں جیتے ہیں، اور میرے لئے یہ بات قابل فخر ہے۔ لوگوں کے زخموں پر میرے لفظ مرہم ہیں یہ میرے لیے بہت ہے۔“ اس نے مگ رکھتے ہوئے ٹانگ ٹانگ پر چڑھالی۔ سکرین پر اسے تکتے ہوئے رئیس کی آنکھوں میں کچھ تھا تو بس ناگواری۔ ”اور جہاں تک بات ہے بہتر کی تو میں خود کو بہترین سمجھتا ہوں۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”اس سفر کا آغاز کیسے ہوا؟“

شاہ ویر نے سادگی سے کندھے اچکائے۔ ”یقین مانیں تو آج بھی یہ ایک خواب لگتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو جب میں اپنے مسودے ہاتھوں سے جلا دیا کرتا تھا کہ کون پڑھے گا؟“

تمکنت نے آنکھوں میں بے تحاشا پیار سمو کر اسے دیکھا۔ شاہ ویر آشیانہ بنگش کا وہ پرندہ تھا جسکی اڑان نے حد اونچی تھی۔ وہ کندھوں پر اس آشیانے کے ہر مکین کو لے کر پرواز بھر رہا تھا۔

”لیکن پھر ایک دن میرا ایک مسودہ کسی دوست کے توسط ایک ایجنسی تک پہنچا۔ وہ ایجنسی شارٹ فلمز بناتی تھی۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ کیا میں اس کہانی کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے تیار ہوں؟“

”آپ تیار تھے؟“

”واللہ میں نہیں تھا۔“ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ بات کرتے ہوئے وہ ہاتھ بہت اٹھاتا تھا۔ ”میں نے انہیں منع کر دیا تھا۔ میں وہ کہانی نہیں دے سکتا تھا۔ اسکے کچھ وقت بعد میں نے اور میری ٹیم نے۔۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رکا۔ ”یہاں میں واضح کر دوں میں فلم میکنگ پڑھتا رہا ہوں۔ میں نے سکرین رائٹنگ بھی پڑھا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ میں ایک cinematographer بھی ہوں۔“

سکرین پر اسے دیکھتے شاہ زید کی نگاہوں میں اب بھی فخر تھا، جبکہ رئیس کی ناگواری بڑھ گئی تھی۔ اسے سننے اور دیکھنے والے کچھ لوگ اس نئی اطلاع پر حیران اور خوش ایک ساتھ ہوئے۔

"میں یونیورسٹی میں تھاجب ہمیں اپنے پراجیکٹ کے لیے ایک شارٹ فلم بنانی تھی اور اس میں میرے دوستوں کے مشورے سے میں کہانی کا استعمال ہوا۔ خیر اسکے بعد کا قصہ تو سب جانتے ہیں۔" اس نے بے نیازی سے ہاتھ اٹھاکر کہا۔ سب جانتے تھے اس ایک شارٹ فلم کے بعد کیا ہوا تھا؟

بیلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بالکل بالکل اس فلم کا لندن کے سب سے بڑے فلم میلے میں لگنا، اور اسکے بعد اس پر کتاب چھپنا، پھر اسی کتاب کو ذرالمبا کر کے فلم بننا ہم سب جانتے ہیں۔" وہ پر خلوص مسکراہٹ سے کہتی رہی۔ چند مزید سوالات کے بعد بیلا اپنے ٹیبلیٹ پر کچھ دیکھتے ہوئے ایک بار پھر کوئی خاص سوال کرنے لگی تھی۔

"شاہ ویر کیا آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اپنے جلائے ہوئے مسودے دوبارہ لکھو؟"

شاہ ویر نے اب کے بے چارگی سے اسے دیکھا۔ "ایک لکھاری کے لئے اسکا جلایا ہوا ڈیلیٹ شدہ، یا پھر مسخ شدہ مسودہ دوبارہ لکھنا ایک ناممکن کام ہوتا ہے۔ اور یہ بات ہم کسی کو سمجھا نہیں سکتے۔" وہ آگے کو ہو بیٹھا۔ اسکے سفید جوتے روشنی پڑنے پر دمک رہے تھے۔ چہرہ مزید روشنی میں مزید اجلا نظر آیا۔

"دیکھیں بیلا الفاظ ہمارے منہ سے ایک ہی بار نکلتے ہیں، ذہن میں ایک ہی بار آتے ہیں، اور لکھے بھی ایک ہی بار جاتے ہیں۔ یہ الفاظ کی ایک انا ہوتی ہے۔ وہ دوسری بار پہلے والی طاقت کے ساتھ نہیں آتے۔" اس نے اعتماد کے ساتھ کہتے ہوئے پتے کی بات بتائی۔

تمکنت بنگش کی گردن اسکے ہر ہر جواب پر اکڑ جاتی۔ پاکستان اور دنیا بھر میں اسے دیکھنے والے لوگ ایک سحر کے زیر اثر اسے سن رہے تھے۔ کوئی کشش، کوئی جادو کچھ تو تھا اس میں وہ دیکھنے اور سننے والوں کو باندھ رہا تھا۔

بیلا کی آنکھوں میں اب کے شرارت ابھری۔ "آپ کی کہانیوں میں تو محبت کو ایک ڈارک فینٹسی کی طرح لکھا گیا ہے لیکن کیا حقیقت بھی یہی ہے؟ یا پھر آپ کی کوئی "سنڈریلا" ہے؟"

اور یہاں کئی آنکھیں یک ٹک سکرین پر جم گئیں۔ اکثریت ان میں صنف مخالف کی تھی۔ بنگش خاندان کو چھوڑ کے لاہور کے ایک چھوٹے سے محلے میں رہنے والی ہیزل آنکھوں والی لڑکی کی آنکھیں بھی سکرین پر جمی تھیں۔ اس نے آدھا کمبل اپنے وجود پر ڈال رکھا تھا آدھا پلنگ سے لٹک رہا تھا اور نگاہیں سکرین پر جمی تھیں۔

شاہویر کی یہ مسکراہٹ صرف ہونٹوں تک محدود نہیں رہی۔ اس مسکراہٹ نے اسکی آنکھیں بھی منور

کیں، کندھے ڈھیلے ہوئے، چہرہ کھل اٹھا۔ "آپس کی بات ہے مجھے ایلسا زیادہ پسند ہے۔"

وہ جس بے فکری سے مسکرا رہا تھا زید کے چہرے پر ویسا ہی تفکر تھا۔ کیا مطلب وہ واقعی بتائے گا؟ ایک منٹ عالمی سطح پر؟

"میری زندگی میں کوئی ہے جس سے میں کہہ آیا ہوں کہ وہ پھولوں کا موسم آنے تک میرا انتظار کرے، اور برف سے ڈرنا چھوڑ دے کیونکہ یہ اسکی طاقت ہے۔ کمزوری نہیں۔"

دیکھنے والوں میں بس وہ ہیزل آنکھیں پر سکون تھیں۔ باقی سب تو خاکستر ہوئے۔

"کوئی ہے جسکی خاطر میں محبت کو امر، اور عشق کو حیات لکھوں گا۔ وہ جو تاریکی میں میرا اجالا ہے، وہ جس کے آگے میرے الفاظ ختم ہونے لگتے ہیں۔ اسے دیکھ کر جی چاہتا ہے دنیا کے سارے کرائم تھرلر، ساری نفرت بھری کہانیاں مٹا دی جائیں اور اگر کچھ لکھا جائے تو بس محبت۔" وہ آنکھوں میں الوہی سی چمک لئے بے خودی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"اسکا ملنا زندگی ہے اور اس سے دوری موت ہے۔ اسے دیکھ کر افسانوں پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ بلکل افسانوں جیسی ہے، بیلا۔" آخر میں وہ جیسے بے بسی سے بولا تھا۔ جیسے الفاظ "اسے" بتانے کو ختم ہو گئے ہوں۔ وہ ہر

دفع شاہ ویر کو یونہی بے بس کر دیتی تھی ایسے کہ وہ برف کا بھاری تودہ اسکے سامنے پگھل جاتا تھا۔ "افسانوں جسی مطلب خیالی؟"

"اوں ہوں خوش گوار اور خوبصورت۔" وہ حتمی لہجے میں بولا۔

بیلا اس سے اور بھی بہت کچھ پوچھ رہی تھی۔ مگر تمکنت بنگش کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ رئیس ششدر تھا اور زید اب تک ٹی وی سے نگاہ نہ ہٹا پایا تھا۔ آشیانہ بنگش اس راز کے لیے تیار نہیں تھا۔

ہیزل آنکھوں والی وہ لڑکی اب موبائل بند کر کے واپس رکھ رہی تھی۔ شاہ ویر نے بالکل وہی کہا تھا جو اسے کہنا تھا۔ اور جو اسے سننا تھا۔

★★★★★★★★★★

مری کی سفاکیت کا قصہ بر طرف کرتے ایک چھوٹی سی رہائشی کالونی کی طرف آؤ تو سہراب یمن اپنی سیاہ کلٹس گلی میں کھڑی کر رہا تھا۔ برف باری کچھ دیر پہلے ہی شروع ہو چکی تھی مگر وہ اس سفیدی سے بے نیاز دکھ رہا تھا۔ گاڑی کی ڈگی سے اس نے گاڑی کو ڈھکنے کے لیے شیٹ نکالی اور اب وہ بڑی پھرتی سے گاڑی کو ڈھک رہا تھا۔ گاڑی ڈھک کر اس نے اوور کوٹ کی جیب سے موبائل نکالا ڈھائی بجنے والے تھے، وہ آج پھر دیر سے آیا تھا۔ ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

اپنے گھر کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر اس نے زور زور سے دروازہ بجانا شروع کیا۔ ساتھ وہ موبائل پر "بیٹا" کو کال ملا رہا تھا۔ اسکے منہ سے اب دھواں نکلنے لگا تھا۔ سردی میں وہ جم رہا تھا، مگر دروازہ تھا کہ کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ سہراب نے واٹس ایپ کھولا اور اسلان کی چیٹ کھول کر وائس پیغام ریکارڈ کرنا شروع کیا۔

"یمن صاحب اگر تمھارے آرام میں خلل نہ پڑے تو آکر دروازہ کھول دو۔" بغیر غصے کے ٹھنڈے لہجے میں کہہ کر اس نے پیغام روانہ کر دیا۔ سٹریٹ پول بند ہونے کے باعث گلی میں اندھیرا اور خاموشی تھی۔ سہراب نے ایک بار پھر دروازہ بجانا چاہا۔ مگر رک گیا کہ محلے والوں کی نیند کا خیال آگیا۔

دفعتاً دروازہ بھی کھل گیا۔ کھولنے والے کی تیوری چڑھی ہوئی تھی، اور آنکھوں میں ناگواری تھی۔ اتنی سردی میں

بھی وہ صرف ایک ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس تھا۔ سہراب کی طرح ہی مضبوط اور چوڑی جسامت، اور چہرے پر وہی بے زاری لیے شاید وہ اسلان ہی تھا۔ ہاتھ میں آئی پیڈ تھا جس میں بجتے کسی واہیات انگریزی گانے کی آواز بند کرنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

"اتنی دیر کیوں لگا دی دروازہ کھولنے میں؟ سہراب اپنی بھاری آواز میں کہتا چوکھٹ پار کرتا اندر آیا۔ اور دروازے

کا لاک چڑھایا۔

"ابھی تک میں نے پَر فٹ نہیں کروائے جس دن کروالوں گا اس دن اڑ کر آؤں گا۔" وہ اکتاہٹ سے کہتا آگے بڑھتا چلا گیا۔ گانا اب بھی بج رہا تھا۔ سہراب نے لب بھینچ لئے۔ وہ اسکی بدتمیزی کا کیا کرتا جو کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ گہری سانس لیتے اس نے دروازہ بند کیا۔ گھر چھوٹا سا تھا دروازہ کھلتے ہی پکے فرش کا صحن تھا، سامنے چھوٹا سا برامدہ جہاں سردی کی وجہ سے بھاری دروازہ تھا۔ جس سے ٹھنڈی ہواؤں کا اندر داخلہ ممنوع تھا۔ کنڈی چڑھا کر اس نے دائیں طرف بنی کیاریوں کی طرف دیکھا تو وہاں پائپ پڑا ہوا تھا جس سے نکلتا پانی اب برف میں تبدیل ہو رہا تھا۔ سہراب نے قہر آلود نگاہ بند دروازے پر ڈالی اور کیاری کے سامنے ہی بنے چھوٹے سے اسٹور کی طرف بڑھا جہاں موٹر، پائپ، کچھ کباڑ رکھا تھا۔ اسی سٹور کی دیوار پر نصب بورڈ کے سارے بٹن بند کیے (بجلی اگر زیادہ پاور کی آئی تو بلب جل بھی تو سکتے ہیں) باہر آکر اس نے واش بیسن کے نلکے سے جڑا پائپ نکالا۔ اس سارے وقت میں سردی اسکے رگ وپے میں سرایت کر گئی تھی۔ ہاتھ باقاعدہ سن ہو رہے تھے۔

پائپ اٹھا کر اندر سٹور میں رکھتے جوتے برامدے کے باہر اتار کر وہ اندر داخل ہوا۔ اور اسے ایک بار پھر طیش چڑھا۔ اسلان کی سیاہ ہیوی بائیک برامدے نماٹی وی لاؤنج میں کھڑی تھی۔ جس کے ٹائروں سے اتری مٹی قالین کے اوپر پڑی تھی۔

”تمہاری محبوبہ کے لیے صحن کم ہے جو اسے بھی یہاں کھڑا کر دیا؟“

”آپ کی گاڑی کی طرح کھٹارا ہوتی تو اسے باہر ہی کھڑا کرتا افسوس یہ اس ڈبے سے تین گنا زیادہ مہنگی ہے۔“

اندر سے وہی تلخ جواب آیا۔ سہر اب نے ضبط کیا، ڈھیر سارا ضبط کیا۔ اسکے علاوہ کوئی چارہ تھا کیا؟

گھر اندر سے کافی چھوٹا تھا۔ برامدہ ہال اور ٹی وی لاؤنج کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ دو کمرے اور ہال کے ہی اندر ایک جانب کو پتھر کی دیواروں والا باورچی خانہ بنا تھا۔ اسلان یمن اس وقت باورچی خانے میں اپنے چچا کے لئے کھانا گرم کر رہا تھا۔ برتنوں کی اٹھا پٹخ جاری تھی۔ سہر اب اپنے کمرے سے منہ ہاتھ دھو کر باہر آ گیا تھا۔ اب اس نے سادہ شرٹ کے ساتھ رف سا ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ ہال میں یو پی ایس کی کرم نوازی سے بتیاں روشن تھیں۔ اسی روشنی میں اسکا سراپا واضح نظر آیا۔

لمبی چوڑی جسامت شاید یہ انہیں وراثت میں ملی تھی۔ کندھے مضبوط، اور قد بلند۔ نقوش عام مگر ہمہ وقت سنجیدگی میں ڈھلے رہتے، آنکھیں بھوری تھیں، عمر سینتیس یا اڑتیس کے قریب تھی۔

لاؤنج میں رکھی چھوٹی سی گول میز پہ آکر اسلان نے کھانا پٹخنے کے انداز میں رکھا اور پھر اندر غائب ہو گیا۔ ساتھ ساتھ وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ سہر اب جانتا تھا وہ کیوں ناراض اور اکھڑا اکھڑا ہے، کل وہ اسے "لعل یمن" لے کر جا رہا تھا ناراض تو اس نے ہونا ہی تھا انار اطارون سے ملاقات کا نام ہی اسکے اندر آگ کے گولے بھر دیتا تھا۔

"تمہیں پتا ہے آج میں نے قاتل کس طرح پکڑا؟" خالی خاموش گھر میں اسکی آواز پلٹ کر واپس آئی۔ اسکی ہانک پر بھی اسلان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایسا ہی تھا ناراض ہو گیا تو آپ کی کسی بات کا جواب نہیں دے گا۔ بس منہ ہی منہ بڑبڑاتا رہے گا۔ سہراب اس سے بے نیاز وہیں چھوٹی میز کے گرد بیٹھا ہانک لگاتا رہا۔

"مقتول کے بھائی نے مجھ سے کہا کہ اسکے گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے اور وہ سو رہا تھا لیکن شور سن کر باہر آیا مگر جب وہ باہر آیا تو ڈاکوؤں نے اسکے بھائی کو گولی مار دی تھی۔ اور وہ موقع پر جاں بحق ہو گیا۔"

چولہے پر چائے کا پانی چڑھاتے اسلان کے ہاتھ ذرا دیر کو تھم گئے تھے، سہراب کہتا رہا۔

"اس نے مجھے بتایا کہ اسکا بھائی رات کو روز اسی طرح لان میں ٹہل رہا ہوتا ہے۔ میں نے مان لیا، لیکن لاش کے پیروں میں سادہ کولاپوری چپل تھے تم سوچوں یمن (وہ اسے پیار سے یمن بلاتا تھا) جو انسان اس قدر ٹھنڈ میں باہر ٹہل رہا ہو گا تو کم از کم گرم جوتے تو پہنے گا ناں؟ یا پھر کوئی گرم سوئیٹر؟ یہاں ثابت ہوا اسکا پہلا جھوٹ اسکا بھائی جاگ نہیں رہا تھا وہ اندر سے باہر آیا تھا کیونکہ اس نے عام سانائٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔"

اسلان اب پانی کے نیچے آگ لگا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اسکے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے۔ آگ کے نارنجی شعلوں نے اسکے نقش واضح کر دیے تھے، مگر بس ایک لمحے کے لیے اگلا لمحہ پھر نیم اندھیرا۔ اسلان کو چچا کی کہانیاں ہمیشہ ڈرایا کرتی تھیں، وہ اِنارا نہیں تھا جو ان کہانیوں سے محظوظ ہوتا۔

"اس نے کہا کہ چور داخلی دروازے سے آئے تھے، لیکن جب میں پچھلے دروازے کی طرف گیا تو وہاں دروازے پر لگے تالے کو تازہ تیل ڈال کر کھولنے کی کوشش کی گئی تھی اور دروازے کے باہر بوٹوں کے نشان تھے کافی سارے بوٹ، تین چار لوگوں کے بوٹ، اور یہ نشان داخلی دروازے پر نہیں تھے۔ یعنی جو بھی لوگ تھے گھر کے پچھلے دروازے سے آئے تھے۔"

پانی ابلا تو اس نے چینی پتی ایک ساتھ شامل کی۔ سہراب نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔

"یہاں سب چھوڑ کر اب ہم گھر کے اندر گئے میں نے گرم پانی کی بالٹی منگوائی اور سب گھر والوں کے ہاتھ باری باری دھلوائے۔"

"ہاتھ دھلوانے کا کیا فائدہ؟" وہ سارے عرصے میں اب بولا تھا۔ سہر اب ہلکا سا بالکل ہلکا سا مسکرایا تھا وہ اسلان کا دھیان بٹا چکا تھا۔ اسلان نے اب چائے میں دودھ ڈالا۔

"یار جس نے قاتل کو اندر آنے دینے کے لئے تالے میں تیل ڈالا ہو گا تو اس کے ہاتھوں پر لگنے والے تیل کی چکنائی بھی تو ہو گی ناں؟ گھر میں ڈاکہ پڑا اور قتل ہوا، یا پھر قتل کو خودکشی بنانے کی کوشش کی جائے تو ایسے میں فوری طور پر ملنے والے چھوٹے چھوٹے شواہد پر غور کرنا چاہیئے۔ اور فوری شواہد اسکے جوتوں پر موجود تھے۔"

اسلان اب باہر آ گیا تھا۔ اسکے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں دو کپ رکھے تھے۔ ان سے اٹھتی بھاپ اسکے چہرے تک آ رہی تھی۔ اسکے نقوش سہر اب سے بہت ملتے تھے۔ "مطلب قاتل کو اسکی کم عقلی نے مروایا؟"

سہر اب جس نے کھانے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا، اب اسلان کے بیٹھنے کے بعد اس نے نوالا بنایا اور ساتھ ساتھ کہنا جاری رکھا۔

"اسے اسکی آرام طلبی نے مروایا.... اسکے پیروں میں جاگرز تھے، جبکہ اس نے کہا تھا کہ چوروں کی آواز سن کر وہ نیند سے جاگا تھا اور اپنے بھائی کو قتل ہوتا دیکھ فوراً بھاگ کر نیچے آیا تھا ایسے میں اسے جوتے پہننے کا وقت کب ملا؟ بات یہ تھی کہ وہ کافی وقت سے نیچے تھا اور سردی کی وجہ سے اس نے جاگرز پہن رکھے تھے۔ جس پر تالا کھولتے وقت تیل کے تین قطرے گر گئے تھے۔ انسانوں کی آرام طلب ہونا بعض دفعہ انکا سب سے بڑا دشمن بن جایا کرتا ہے۔" اب اس نے نوالا منہ میں رکھا تھا ساتھ چائے کا گھونٹ بھرا، وہ چائے کا دیوانہ تھا۔ کھانے کے ساتھ اسے چائے بھی چاہیے ہوتی تھی۔

کھانا کھاتے ہوئے اس نے غور سے اسلان کو دیکھا۔ سفید شرٹ کے اوپر سیاہ اپر پہنے وہ رف ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ جسامت سہراب کی طرح چوڑی اور مضبوط تھی۔ پچیس کی عمر میں وہ اٹھائیس انتیس کا لگتا تھا۔ بال گھنے تھے، اور رنگت گندمی۔ اسکی آنکھیں گہری بھوری تھیں مگر بجھی ہوئی۔ کچھ تھا اس میں جو کھٹکتا تھا۔ اسکا مکمل خاکہ ایک عام سے لڑکے کا بنتا تھا۔ ہاں اگر وہ اپنے آپ پر توجہ دینے لگے تو "پرکشش" بھی کہلایا جاسکتا تھا۔ لیکن ایسی کوئی زحمت وہ کرتا ہی نہیں تھا۔

"کل میری چھٹی ہے لعل یمن چلیں گے آراہ ملنا چاہتی ہے۔" سہراب نے اسکی چپ کو بھانپتے اسے بتایا تھا یکدم اسکے چہرے کا رنگ تاریک ہوا۔

"میں... میں بزی ہوں میرا کام ہے آپ چلے جاؤ۔" وہ نظریں چرا رہا تھا۔

"میں تم سے پوچھ نہیں رہا بتا رہا ہوں۔ آراہ کو ناں نہیں کہہ سکتا میں۔ اور تم اب بڑے ہو جاؤ بچوں کی طرح اپنے مسائل سے بھاگنا بند کر دو۔" اسکی آواز میں سختی تھی وہ ہمیشہ سے اسے اپنے جیسا بنانا چاہتا تھا۔ مضبوط، رف ٹف، ایک دیوار جس کے آر پار کوئی نہ جھانک سکے، لیکن وہ ہر بار اپنے ماموں والی حرکتیں کر جایا کرتا تھا۔ (ماموں والی حرکتوں کا خلاصہ پھر سہی)

"عالمگیر کے وکیل سے بھی ملنا ہے اور بھی بہت کام ہیں۔"

اگلے کئی منٹ اسلان چپ چاپ بیٹھا میز کی سطح کھرچتا رہا۔ اسکی بدتمیزی ایک طرف ہوگئی۔ وہ اب مضمحل نظر آ رہا تھا۔ سہراب کھانا کھا چکا تھا۔ برتن وہیں رہنے دیے۔ باورچی خانے کی کھڑکیاں اور دروازہ بند کرتے اب وہ اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا جب اسلان کی آواز نے اسکے قدم روک دیے تھے۔

”ماموں کہتے ہیں آپ کو آراہ کی جائیداد میں دلچسپی ہے اسی لئے آپ کو اسے ناں کہنا مشکل لگتا ہے، اور مجھے جھڑک دینا آسان کیونکہ میرے نام چند چیزوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اگر نانو نے اپنی جائیداد میرے نام کی ہوتی تو شاید میں بھی اہم ہوتا۔“

اسلان کی آواز ہلکی تھی بے حد ہلکی۔ نہ اس میں کوئی طنز تھا نہ غصہ وہ بس بتا رہا تھا۔ ایک اطلاع کی طرح۔ سہراب کے قدم چند لمحہ چوکھٹ پر جمے رہے۔ چہرے پر کچھ نہ تھا۔ ”اپنے ماموں سے کہنا جنت سے اتر افرشتہ تو وہ خود بھی نہیں۔ عدالت میں رو رو کر وہ آراہ کی ہی تحویل کیوں مانگ رہا تھا جبکہ تم بھی تو اسکے بھانجے ہو؟“ اسلان اور انارا کی نانی نے وفات سے قبل اپنی جائیداد کا مخصوص حصہ آراہ کے نام کر دیا تھا۔ اس وراثت کے پیچھے محض محبت تھی جو انکو انارا سے تھی۔ مگر اس جائیداد کے لیے آراہ سے کس کس کو محبت تھی یہ بُوجھنے کے قصے ہیں۔

اپنی بات کہہ کر وہ رکا نہیں تھا۔ اسلان نے زخمی انداز میں سر جھٹکا۔ نہ اسکا ماموں اس سے محبت کرتا تھا نہ چچا اور

ماں باپ تو کسی کھاتے میں نہیں آتے تھے۔ اسکی خود ترسی اور انارا طاروں سے اسکی ناپسندیدگی کا گراف بڑھ گیا۔

★★★★★★★★★★

اسی رات میں چند گھنٹے پیچھے

شہر لاہور، وقت رات دس بجے۔

سردیاں آتے ہی لاہور شہر کی فضاؤں میں جیسے بھاپ بھرنے لگتی تھی۔ صبح سویرے جو دھند اترتی تو رات کی سیاہی اترنے تک دھند کا پیش خیمہ لاہور ہی رہتا۔ دسمبر کی اس ٹھٹھرتی رات میں لاہور کی ایک چھوٹی سی رہائشی کالونی کے باہر چوڑی سڑک پر دو ہیولے چلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"ماموں آج کا میچ تو بے کار تھا۔ سارا کام تو اوپنرز نے خراب کر دیا۔" ایک ہاتھ میں آئس کریم کا کون پکڑے دوسرے ہاتھ میں لیے موبائل کی سکرین پر نگاہ دوڑاتے نسوانی ہیولے نے کہا۔ سٹریٹ پولز کی تیز روشنی میں چوڑی سڑک صاف اور واضح نظر آرہی تھی۔

"پاکستان کی ٹیم کا ہر روز کا قصہ ہے اس لیے میں میچ دیکھتا ہی نہیں۔" یافث نے سرسری تبصرہ کیا۔ اسکا دماغ کہیں الجھا ہوا تھا۔ پاکستان کے ہر دسویں انسان کی طرح اسے کرکٹ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور اسکے ساتھ چلتی لڑکی وہ مداح تھی جو سانس لینا چھوڑ سکتی تھی ٹیم کی حمایت کرنا نہیں۔

"بڑے ہی کوئی بدذوق انسان ہیں آپ۔" موبائل سے نگاہیں اٹھا کر اس نے اپنے ساتھ چلتے آدمی کو دیکھ کر تاسف سے کہا۔ "سہراب چاچو ہوتے تو آپ دیکھتے ہم نے کس طرح پچ کے شجرہ نسب سے لے کر بالر کے ماضی تک کا سفر طے کر لینا تھا۔"

"میرے پاس تمہارے چچا جتنا فضول دماغ نہیں ہے، آراہ۔" اس نے گردن پھر کر لڑکی کو دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا۔ پرکشش نقوش اور مہربان مسکراہٹ والا یافث طارون مزاج پر ایک خوشگوار تاثر چھوڑتا تھا۔

"یہ کہیں کہ آپ کے پاس دل نہیں ہے۔" اس نے اسی مصروفیت سے کہا۔ "یا اللہ کبھی ہمیں بھی جتوا دو۔ کب تک دل جلائیں؟"

یافث نے جواب دھیان دیا۔ وہ آئرہ سے چھ قدم آگے کھڑا تھا اور وہ اپنی جگہ پر کھڑی تھی آئس کریم کا ایک بڑا حصہ بغیر کھائے وہ پھینک چکی تھی اور اب موبائل پر کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ سردی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن یافث جم گیا تھا۔ جانے کیوں؟ وہ لکھتے ہوئے مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"آراہ؟" اس نے مدھم آواز میں پکارا۔ آراہ کا دھیان اس طرف نہیں گیا وہ اب بھی کچھ لکھ رہی تھی۔ پھر ہلکا سا ہنسی، چہرہ سرخ ہوا۔ "آراہ؟ ہم چلیں؟"

دفعتاً وہ چونکی اپنی بے اختیاری پر اسے جیسے شرمندگی ہوئی۔"جی..جی چلیں۔"

یافث نے غور سے اسکا ہر ہر تاثر دیکھا۔ وہ ہڑبڑاہٹ، وہ مدھم مسکان، وہ رخساروں کی سرخی اس نے بہت کچھ نوٹ کیا تھا مگر چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر تک وہ دونوں یونہی ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ البتہ یافث کا چہرہ بدل گیا تھا۔

"ماموں آپ نے مجھے ایک ہی آئس کریم کیوں دلوائی یار، ختم ہوگئی۔" وہ نروٹھے پن سے شکوہ کر رہی تھی۔"اپنے لیے بھی نہیں لی ورنہ میں وہیں کھا لیتی۔"

"اپنے لیے بھی لیتا تاکہ تم وہ بھی کھاؤ اور تم یہاں جم جاؤ۔ ویسے تمھیں برف سے ایسا بھی کیا جنون ہے ؟کون سردیوں میں آئس کریم کھاتا ہے ؟" اسکے ساتھ چلتے ہوئے مرد نے ناگواری سے کہا۔

انارا نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔"بد ذوق آدمی، حصہ دوئم۔"

"ہاں بھئی یہ ذوق تمھیں اور تمھارے چچا کو مبارک ہو۔ غلط کسٹڈی لے لی ہم نے، تمھیں وہاں بھیجنا تھا۔ اور اسلان کو یہاں لانا تھا۔"

"شکر ہے ایک عرصہ بعد آپ نے مان لیا۔" وہ اسی انداز میں بولی۔ یافث نے گھور کر اسے دیکھا۔"اچھا یہ بتائیں ماموں ہم کل لعل یمن جائیں گے ناں ؟" وہ گلی میں ایک جگہ رک گئی تھی۔ لہجے میں اب شوخی نہیں تھی وہ یکدم بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ یافث اسکے ساتھ ہی ٹھہر گیا۔ اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو غور سے دیکھا۔

سٹریٹ پولز کی روشنی میں اسکا سراپا پہلی بار بہت واضح تھا۔

سانولی سی رنگت، واجبی نقوش اور بھرا بھرا جسم وہ بہت زیادہ موٹی نہیں تھی لیکن صحت مند تھی۔ گال پھولے پھولے تھے اور سیاہ رنگ کے کڑھائی والے کرتے کے ساتھ جینز پہن رکھی تھی۔ بال لمبے تھے جو کندھوں سے آگے ڈھلک رہے تھے۔ نہ زیادہ گھنگریالے نہ سیدھے rough curlsایک بہتر لفظ ہو گا۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھی، نہ بے حد پرکشش عام بہت ہی عام چہرہ تھا اسکا جو کبھی بھیڑ میں نظر آئے تو یاد نہ رہے۔

یافث قدم قدم چلتے ہوئے آگے آیا اور اسکے سامنے آکر رکا۔ اسکی شال کا ڈھلکتا پلو اٹھا کر اسکے کندھوں پر درست کیا اور اسکی آنکھوں کے خوف کو بھانپتے اسکا کندھا ہلکے سے تھپتھپایا۔ "کیا کبھی یافث طارون نے انارا طارون سے جھوٹا وعدہ کیا ہے؟" وہ اسے سن رہی تھی لیکن سماعتوں میں کوئی اور اعلان بھی جاری تھا۔

(تمہارا ماموں جھوٹا ہے وہ اگر وعدے نبھانے والا ہوتا تو اسلان کے کے ساتھ کئے ہوئے وعدے بھی نبھاتا۔ تمھارے ساتھ نہیں تمہاری جائیداد کے ساتھ مخلص ہے وہ۔" سہر اب کی چبھتی آواز نے اسکے کانوں کو سن کر دیا تھا۔)

"ہم کل جائیں گے جب جب تم چاہو گی ہر دفع جائیں گے پریشان کیوں ہوتی ہو؟"

آراہ محض پھیکا سا مسکرائی، اور وہ دونوں دوبارہ ایک ساتھ چلنے لگے۔ اب کے انکا رخ گھر کی طرف تھا۔ اس نے یافث سے آج تک یہ نہیں پوچھا تھا کہ جب انکے والدین کے درمیان طلاق ہوئی تب اسلان سے ہوئے وعدے کے مطابق یافث اسلان کی تحویل لینے والا تھا پھر اس نے اور اسکی ماں نے آراہ کی تحویل کیوں مانگی؟

اسکے پاس رشتوں کے نام پر یہی چند تعلقات تھے، وہ ان کو کسی بھی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں کھونا چاہتی تھی۔ یہ تین مرد چاہے وہ لالچ سے ساتھ رہیں چاہے محبت سے بس اس کے ساتھ رہیں۔ ہمیشہ۔

"تم اس سے بات کرنے کی کوشش کرو، آراہ۔ وہ تمہارا بھائی ہے کیا پتہ وہ پگھل جائے۔ دلوں پر جمی برف جیسی بھی ہو ایک نہ ایک دن اسے پگھلنا ہی ہوتا ہے۔" یافث نے ایک بار پھر بات شروع کی تھی۔ آراہ نے شال کندھوں پر جمائی اور ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ چہرے پر ڈھیر ساری سنجیدگی تھی۔ ایک اور آئس کریم اور میچ ہارنے کا غم یاد ہی نہیں رہا۔

"اسکے دل پر برف کا سحر ہو گیا ہے۔ اور برف اپنے سحر زدہ لوگوں کو جلدی آزاد نہیں کرتی۔" وہ یاسیت سے کہہ رہی تھی پھر یکدم اسکے لبوں کو ایک اداس مسکراہٹ نے چھوا۔ "کوئی ہے ماموں جسے لگتا ہے ساحر برف کو بس ایک ہی چیز پگھلا سکتی ہے۔"

"محبت؟" سوال ہوا۔

"محبت۔" جواب ملا۔

پھر ایک لمبا وقفہ خاموشی کا آیا۔

"میں تو اسلان سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن اسکا سحر ٹوٹتا ہی نہیں ہے۔ وہ دن بہ دن گلیشیئر بنتا جا رہا ہے اور میں کچھ نہیں کر پا رہی۔ اسکو پتا نہیں کیوں مجھ سے اتنی چڑ ہے۔" بہت دیر بعد جب وہ بولی تو اسکی آواز میں واضح ملال تھا۔

وہ دونوں اب ایک رہائشی عمارت کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اسی عمارت کا فلیٹ نمبر 37 آراہ اور یافث طارون کا گھر تھا۔

"یہ سب تمہارا چچا کر رہا ہے۔" فلیٹ کا دروازہ چابی سے کھولتے ہوئے وہ بہت دیر بعد بولا۔ "وہ چاہتا ہے اسلان تم سے بغض پال لے وہ اتنا بے زار ہو جائے کہ جائیداد میں حصہ تک مانگے بغیر یہاں سے کہیں دور چلا جائے تاکہ بعد میں وہ تمہارا وارث بن کر تمہاری جائیداد کو اپنا کر سکے۔ حالانکہ یہ سارا ترکہ میری مری ہوئی ماں کا ہے۔ اس پر سہراب کا کوئی حق نہیں۔"

اندھیری راہداری اندر سے آتی روشنی میں اجاگر ہوئی۔ انارا اس روشنی میں ٹھہر سی گئی۔

"پتا نہیں کب سدھریں گے یہ لوگ، اصل کمینہ انسان تو تمہارا باپ ہے۔ بے غیرت آدمی۔"

اندر داخل ہوتے ہوئے یافث زہر خند لہجے میں کہہ رہا تھا۔ آراہ کی آنکھوں کے آگے منظر بدل گیا ایک ہی لمحے میں وہ ادھ روشنی، ادھ اندھیرے سے مکمل اندھیرے میں آ گئی۔ مری کا وہ چھوٹا گھر، بند بتی اور اب وہ سہراب کے سامنے بیٹھی تھی۔ ان دونوں کی رنگت ایک جیسی تھی۔ وہ چہرے پر فکر مندی لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

" آراہ دیکھو اسلان اور میرے درمیان مسائل رہتے ہیں۔ لیکن یافث اور اسلان کا جو تعلق ہے ہم سب جانتے ہیں۔ اسلان کو اگر کوئی سمجھا سکتا ہے تو وہ یافث ہے میں نہیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرے گا جانتی ہو کیوں؟"

انارا نے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ ان میں کئی سوال تھے۔ جن کے جواب اسے کبھی نہیں مل سکے تھے۔ "وہ تم دونوں کا تعلق ٹھیک نہیں ہونے دینا چاہتا، کیونکہ اس طرح اسلان تمہارا اصل وارث بن جائے گا اور طارون کو تمہاری جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور تمھیں کیا لگتا ہے وہ لالچی آدمی ایسا چاہے گا؟ وہ...... وہ.... وہ۔۔۔۔۔۔۔"

سہراب کے الفاظ ٹوٹ گئے تھے۔ وہ اپنے موبائل کے پیغام کی آواز پر خیالوں سے جاگی۔ یافث اپنی بات مکمل کرتا

کب اندر گیا اسے علم بھی نہیں ہو سکا۔ وہ غائب دماغی سے چوکھٹ پار کرتی اندر داخل ہوئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کیا۔ سوئیٹر کی جیب سے اپنا موبائل نکال کر دیکھا اور اس کی افسردگی لمحے بھر میں غائب ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے وہ ہر رنج بھول گئی۔

"میں آج سارا دن مصروف رہا یار۔ ابھی بھی تھکا ہوا ہوں لیکن تمھارے ساتھ ایک فیس ٹائم بُرا سودا نہیں۔ مجھے کال کر لو، ورنہ میں کر رہا ہوں۔"

"میں ماموں کے ساتھ ہوں۔"

"انہیں بھی کال پر لے لو آج ملاقات ہو ہی جائے۔"

"کیوں وقت سے پہلے مرنا چاہتے ہو؟" وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"تمھارے ماموں فرعون کے زمانے میں جلاد تھے کیا؟"

"انسان بنو۔۔۔۔۔" آراہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

اسکی ساری فکریں زائل ہو چکی تھیں۔ وہ اب کھٹاکھٹ ٹائپ کرنے لگی تھی۔ رنگت بحال ہو رہی تھی اور ہیزل آنکھوں میں رنگ اتر آئے تھے۔ اپنے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑے یافث کی پر سوچ نگاہیں اس پر جمی رہیں۔

★★★★★★★★★★

نیویارک امریکا کا دل ہے۔ روشنیاں، بڑی بڑی عمارات، کلبز، کیفے، لائبریری، بڑے بڑے شاپنگ مالز، اور فیشن کا

مرکز۔ اس شہر کی راتیں دلکش اور دن معطر ہوتا ہے۔ نیویارک میں مقامی اور غیر مقامی لوگوں کی بہتات راتوں کو کسی تقریب، کیفے، یا کلبز کا رخ کرتی ہے ایسے میں ایک شخص تھا جو مینہٹن کے ایک مہنگے کیفے سے کافی کا کپ خرید کر باہر نکل رہا تھا۔ سڑک پر جابجا گاڑیاں کھڑی تھیں اور انہی گاڑیوں کے چمکدار شیشوں میں اسکا عکس ابھر رہا تھا۔ وہی جو کافی شاپ سے باہر نکل رہا تھا۔ سفید رنگ کے وی نیک بٹنوں والے سوئیٹر سے اسکی سفید کف شرٹ کے کالر نظر آرہے تھے۔ پیروں میں سیاہ اسنیکرز تھے۔ اور ہاتھ میں فیروزی رنگ کا کافی کا کپ۔ گلے میں پڑی چین دمک رہی تھی۔

"میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں کوئی اندازہ ہے؟"

گاڑی کے شیشے میں بنتا اسکا عکس مٹ گیا کہ اب وہ کیفے کے باہر سرخ رنگ کے چھجے تلے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے موبائل پر کسی لڑکی کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ جو مسکراہٹ دبائے ہوئے تھی۔ اس کے عقب میں نظر آتا سارا کمرہ بکھرا ہوا تھا۔

”سچ سچ بتادو ایلسا کہیں میں تمہارا سوتیلا پیار تو نہیں؟“ joe coffee کا فیروزی کپ دھپ سے میز پر رکھتے شاہ ویر بنگش نے بے حد خفگی سے کہا تھا۔ دوسری جانب مدھم سی ہنسی سنائی دی۔

”سوتیلی ماں ہوتا ہے، سوتیلا باپ، سوتیلے بہن بھائی بھی یہ سوتیلا پیار کیا ہوتا ہے؟“ وہ اپنے بکھرے ہوئے کمرے کے سامان سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”وہی جو تمھارے اور میرے درمیان ہے۔ بلکہ صرف تمہاری طرف سے ہے۔“ اسکی خفگی ہنوز برقرار تھی، البتہ ماتھے کے بل غائب ہو رہے تھے۔ ”اچھا ذلیل کرتی ہو تم مجھے یہاں میں کالز اور میسجز کرتا رہتا ہوں یہاں تم غائب رہتی ہو۔“

جو کافی کے باہر لوگوں کا رش بڑھ رہا تھا۔ نیویارک کی تازہ صبح میں لوگ دفتر اور مکتب روانہ ہونے سے پہلے کسی کافی کی دکان کے باہر ضرور رکتے تھے۔ انہی لوگوں میں سے کسی لڑکے نے اسکے موبائل کی طرف دیکھا شاہ ویر نے چہرہ بگاڑتے ہوئے موبائل اونچا کر لیا۔

”میں مصروف تھی، شاہی۔ بتایا بھی تھا مجھے ”سخن ساز“ میں نوکری مل گئی ہے۔“

ماتھے کے غائب ہوئے بل دوبارہ نمودار ہوئے، اس بار چہرے پر تناؤ بھی در آیا تھا۔ جہنم میں گئی کافی یہاں تو اسکا دل جل کر رہ گیا تھا۔

”میں نے تم سے کہا تھا تم اس جیولری شاپ میں کام نہیں کرو گی اور وجہ بھی بتائی تھی۔ میں نے بتائی تھی ناں؟“ اسے کیا برا الگ رہا تھا؟ کافی، صبح، سامنے والے کا اسکی کال دیر سے اٹھانا، یا پھر یہ نوکری شاہ ویر اندازہ نہیں کر سکا۔

ایلسا کے چہرے کے زاویے سخت ہوئے۔ ”میں کسی کی اجازت کی پابند نہیں ہوں، شاہی۔“ ہاتھ میں پکڑی کتاب شیلف میں اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے اطلاع دی۔

شاہ ویر نے خود کو کچھ سخت سست کہنے سے روکا وہ اسے منع کرتا بھی تو کیسے؟ دنیا کی نظر میں ان دونوں کا تعلق کیا تھا؟ اگر وہ یہاں امریکہ کے اس شہر میں بیٹھ کر سوچے تو "گرل فرینڈ، بوائے فرینڈ" اور اگر خود کو گھسیٹ کر لاہور نامی کسی خطے میں جا کر بیٹھے اور ایک بار پھر اپنے اور اسکے تعلق کا موازنہ کرے تو اسے کوئی مہذب لفظ نہ مل سکے۔

"بالکل تم کسی کی پابند نہیں۔ لیکن ہمارے درمیان ایک وعدہ تھا۔" اسکے انداز میں چبھن تھی۔

"میں دہرائے دیتی ہوں۔" سکرین کے چوکھٹے میں شاہ ویر نے اسے کھڑے ہوتے پھر الماری کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے پر پابندی نہیں لگائیں گے ہاں البتہ "صورتحال" کا جائزہ ہم دونوں پر لازم ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ کوئی ایسی صورتحال، یا کوئی ایسی چیز ہے جو مجھے اس کام کو کرنے سے روکے۔" الماری سے مختلف جوڑے الٹ پلٹ کرتے ہوئے اس نے مصروفیت سے جواب دیا۔

شاہ ویر نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ اپنے ذہن کی سکرین پر ابھرتی اس چھ فٹ چوڑی اور اپنی ہم جنس شبیہہ کو خیال ہی خیال میں آنکھوں سے نگلا، اور بہ دقت مسکرایا۔

"اگر تم اس جاب سے خوش ہو تو ٹھیک ہے۔ میں "صورتحال" کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"well and good" اسے سراہا گیا۔

اس لمحے شاہ ویر نے اندازہ لگایا کہ مرد کو محبت نہیں کرنی چاہیے اور کر لے تو اظہار کے معاملے میں کنجوسی کا مظاہرہ کرنا چاہیے ورنہ عورت دل سے سر چڑھ جاتی ہے اور یہ محبت میں مبتلا مرد کا دل ہوتا ہے کہ وہ سر چڑھی عورت کو بھی اف نہیں کہہ سکتا۔

"خیر یہ بتاؤ۔" this or that? وہ واپس کیمرے کے فریم میں نظر آئی۔ اسکے ہاتھ میں دو جوڑے تھے جو وہ شاہ ویر کو دکھا رہی تھی۔ کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے شاہ ویر نے ایک جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ ایلسا نے وہی جوڑا کرسی پر رکھا اور دوسرا جوڑا گود میں لیے کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ چہرے پر خالص فکر تھی۔

"تم ناراض ہو؟"

شاہ ویر کچھ لمحے غور سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر نفی میں سر ہلایا۔"میں انسکیور ہو رہا ہوں۔ تم وہاں اسکے ساتھ کام کرو گی مجھے اچھا نہیں لگے گا۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔"لیکن مجھے تم پر یقین ہے اس لیے آگے بڑھتے ہیں۔" کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی اس نے کپ اٹھایا اور اٹھ کر سڑک کنارے بنے کچرے دان میں ڈال دیا۔ موبائل یونہی چہرے کے آگے تھا۔ وہ کم از کم اسے ناراض کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔"گھر میں کب بات کرو گی؟"

اس نے دیکھا وہ نچلا ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم جڑ گئیں اور یہ ہوا اسکا اضطراب شروع۔"پہلے تم اپنی مام سے بات کرو ناں۔"

"مام اب خود مجھ سے بات کریں گی۔" وہ لاپرواہی سے کہتے ہوئے سڑک کے کنارے کھڑی اپنی سفید پورشے کا دروازہ کھولتے اندر بیٹھ رہا تھا۔ آنکھوں پر چشمہ چڑھایا اور ڈرائیور سے گاڑی آگے بڑھانے کو کہا۔"اگر میں مام سے بات کرتا تو انہیں لگتا شاہ ویر کو ایک اور بار کرش ہوا ہے لیکن اب۔۔۔۔۔" پچھلی نشست پر بیٹھے نیویارک کی ازہ صبح کو تکتے وہ مسکرایا۔

"اب مام جان گئی ہیں اگر میں ٹی وی پر کچھ کہہ رہا ہوں تو اسکا مطلب ہے میں سیریس ہوں۔ تم بتاؤ کب ملواؤں تمھیں تمہاری ساس سے؟"

وہ جتنی لاپرواہی سے کہہ رہا تھا ایلسا کے رونگٹے اسی تیزی سے کھڑے ہو رہے تھے۔"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"لگنا تو مجھے چاہیے تم ساری زندگی کے لیے گلے پڑنے والی ہو۔"

"میں سنجیدہ ہوں یار۔"

"قسم لے لو میں نے نشے کر کے انٹرویو میں تمہارا نام نہیں لیا، میں بھی سنجیدہ ہوں۔"

"میں گھر پر کیسے بات شروع کروں؟"

"زبان سے ڈھائی گز لمبی تو ہو گی ناں؟"

"تم سے بات کرنا ہی فضول ہے، مجھے تم سے کوئی شادی نہیں کرنی۔" اس نے غصے سے لیپ ٹاپ کی سکرین گرا دی۔ شاہ ویر کے چہرے پر محظوظ کن مسکراہٹ قائم رہی مگر صرف ایک لمحے تک اگلے ہی لمحے اسکی نظر اپنی دائیں طرف نشست پر پڑے ایک چھوٹے سے ڈبے پر پڑی۔ اسکی مسکراہٹ لمحے کے ہزارویں حصے میں غائب ہوئی۔ وہ کتنے ہی لمحے پھٹی پھٹی نظروں سے لکڑی کے اس ڈبے کو دیکھتا رہا جس پر چاقو یا کسی تیز دھار آلے سے لکیریں کھینچی گئی تھیں۔ اسکا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ آواز کانوں تک آئے۔

"یہ ڈبہ یہاں کیسے آیا؟" اس نے سراسیمگی کی کیفیت میں ڈرائیور سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا سر جب آپ گئے تو یہ یہیں تھا۔"

شاہ ویر نے ڈھیر سارا تھوک نگلا، چہرے کے تاثرات بمشکل معتدل رکھے اور ہاتھ بڑھا کر ڈبہ اٹھالیا۔ اسکی سفید لمبی انگلیاں ہلکا سا کپکپارہی تھیں۔ ڈبے کی دائیں طرف سفید رنگ کا چھوٹا سا نوٹ چسپاں تھا جس پر انگریزی میں "تم اکیلے نہیں ہو، میری موجودگی محسوس کرو۔" درج تھا۔ لکھائی عجیب طرز کی تھی۔ ایسی جیسی کسی پرانی انگریزی کتاب کی ہو۔ اسکی رنگت زرد پڑ رہی تھی۔ نوٹ پھاڑ کر اپنی مٹھی میں دبوچتے ہوئے اس نے تیزی سے ڈھکن ہٹایا اور اگلے ہی لمحے شاہ ویر بنگش حلق کے بل چیخا تھا۔ اسکا سانس اٹک گیا تھا۔

ڈبے سے کئی چھوٹے چھوٹے بچھو نکل کر اسکی ٹانگ، بوٹ، سوئیٹر اور بازو پر رینگ گئے۔ ڈرائیور نے بوکھلا کر گاڑی روکی۔ شاہ ویر نے تیزی سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اسکی کروڑوں کی گاڑی کا قیمتی دروازہ سڑک کے کنارے کھڑی موٹر سائیکل سے ٹکرایا اور اس پر کئی داغ پڑے۔

گاڑی کا دروازہ دوسری طرف سے کھولتے ہوئے وہ باہر آیا نوچ کر سوئیٹر اتار کر وہیں سڑک پر پھینکا اور اپنے سارے جسم سے ان بچھوؤں کو جھٹکنے لگا۔ اسکا ڈرائیور بھی یہی کام کر رہا تھا۔ کبھی وہ شاہ ویر کے بازو پر نادیدہ کیڑے کو بھگاتا، کبھی سینے سے۔ کبھی گردن سے، اور کبھی ہاتھوں سے۔

اگلے چند لمحے یہی ہوتا رہا۔ کچھ بچھو شاید گاڑی کے اندر رہ گئے تھے، اکا دکا سڑک پر کہیں بھاگ گئے اور باقیوں کا ٹھکانہ خدا جانے۔ شاہ ویر وہیں کھڑا بے یقینی سے کبھی اپنے ہاتھ دیکھتا، کبھی سینہ مسلتا اور کبھی اپنے کپڑوں پر ہاتھ مارتے ہوئے اس احساس کو جھٹکتا، خوف اسکے رگ و پے میں خوف بھر گیا تھا۔ وہ بغیر سانس لیے تحیر زدہ سا وہاں کھڑا تھا۔ کتنے لوگ اسے دیکھ رہے تھے؟ چند لمحوں کے اندر وہ کس جہنم سے گزر کر آ گیا تھا؟

وہ جو کوئی بھی تھا شاہ ویر اسے محسوس کر چکا تھا۔ اور اگلے کئی ہفتے اسے یہ بچھو اپنے ارد گرد محسوس ہونے والے تھے۔ خوف سے اسکا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ یہ پہلی دفعہ نہیں تھا۔ اور یہ آخری بار بھی نہیں تھا۔

★★★★★★★★★★★★★

آشیانہ بنگش کے منظر پر لگی تابناک روشنیاں اور سبزہ زار کے درمیان کھڑی سیاہ عمارت یہ کوئی الگ ہی امتزاج تھا۔ سیاہی اور سفیدی کا ایک بے عیب ملن۔ یا شاید ایک پر سرار ملن۔ رئیس بنگش اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ یوں کہ کمر پلنگ کے تاج سے جوڑ رکھی تھی اور پیر لمبے کر رکھے تھے۔ اسکی دائیں طرف اسکا بیٹا سو رہا تھا جس

کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اسکی نگاہیں دور کہیں جمی تھیں۔ پر سوچ اور، متفکر نگاہیں۔

پلنگ کے عین سامنے سنگھار میز کے آگے رکھی کرسی پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ اٹھائیس انتیس برس کی خوش شکل عورت، جس کی رنگت بے حد صاف تھی اور بال لمبے جو کہ اس وقت پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ کافی خوبصورت تھی۔

"حسین سو گیا ہے لائٹ بند کر دو، نایاب۔" رئیس نے اپنی بیوی کو ہلکی آواز میں مخاطب کیا۔ آئینے میں ان دونوں کا عکس ساتھ ساتھ بن رہا تھا۔ رئیس اچھا دکھتا تھا، اپنی ماں سے یکسر مختلف۔ آنکھیں سیاہ تھیں اور رنگت گندمی مائل۔ ناک اٹھی ہوئی، چوڑا ماتھا اور بال سیاہ۔

"حسین کو اسکے کمرے میں لٹا کر آئیں، کتنی بار کہا ہے اب وہ بڑا ہو رہا ہے اسے اپنے کمرے میں سونا چاہیے۔" اسکی بیوی نے خفگی سے کہا۔ اسکے مزاج خراب معلوم ہوتے تھے۔

رئیس نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔ شب خوابی کے لباس وہ اپنے گورے بازوؤں پر لوشن مل رہی تھی۔ اسکے انداز میں جارحیت تھی چہرے پر دبا دبا غصہ بھی۔

"تمھیں کیا ہوا ہے؟"

پوچھنے کی دیر تھی اور وہ پھٹ پڑی۔

"رئیس.. آپ نے دیکھا تھا ناں آج کس طرح مام نے مجھے مہمانوں کے سامنے ذلیل کیا۔" وہ آئینے میں اپنے شوہر کے عکس کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں نے کہا ہی کیا تھا آخر؟ یہی ناں کہ میرے بیٹے کا نام حسین مخدوم ہے بنگش نہیں۔ اور اس میں غلط ہی کیا ہے آخر تو تم مام کے پہلے شوہر کے بیٹے تو ہو۔ آپ رئیس بنگش نہیں رئیس مخدوم ہو۔ اپنا اصل مان لینے میں برائی ہی کیا ہے؟ بابا نے آپ کی شادی مجھ سے اس لیے کروائی تھی کیونکہ آپ انکے مرحوم بھائی کی نسل ہیں اور اس لیے کہ ہم اپنی نسل کی حفاظت کرتے ہیں پھر میں کس طرح اپنے بیٹے کو بنگش بنا دوں؟" وہ بھرائے ہوئے انداز میں کہتی رہی۔ اسکے شوہر نے چند لمحہ نرم نظروں سے اسے دیکھا۔ رئیس کی آنکھوں میں اب تھکن بھی تھی۔ شاید وہ خود بھی اپنے نام کے ساتھ بنگش لگا کر تھک گیا تھا۔ شاید یہ بس ایک نام نہیں تھا ایک بوجھ تھا۔ یا شاید اس سے اب ماں کی بے اعتنائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"تم فکر مت کرو، نایاب۔ جس نام پر مام کو فخر ہے وہ چند دنوں میں مٹی ہو جائے گا۔ بس کچھ دن اور۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" نایاب نے لوشن کی ڈبیا بغیر ڈھکن کے وہیں چھوڑ دی اور اسکے قریب آکر بیٹھی۔ آنکھیں متفکر انداز میں چھوٹی ہوئیں۔

"میں نے ساری زندگی غلامی کی نایاب۔ مام کی انکے شوہر کی، انکے بچوں کی بھی۔ لیکن مجھے میری ریاضت کا کوئی صلہ نہیں ملا۔ ہر بات شاہ ویر سے شروع اور شاہ ویر پر ختم ہوئی۔ ہر فکر شاہ زید کی اور ہر پرواہ تاجور کی۔ رئیس کہاں ہے؟ کہیں نہیں؟" اس نے استہزاہ سے سر جھٹکا۔ آنکھوں میں کرچیاں تھیں۔ اسکی بیوی اسے بس سنے گئی۔ آج پہلی بار تھا جب وہ اسکی شکایات کے جواب میں بھی کچھ بولا تھا۔ شاید وہ ماں کی بے اعتنائی سے واقعی بد دل ہوا تھا۔

"تمھیں پتا ہے نایاب رئیس وہ ہے جس نے انکے پروڈکشن ہاؤس کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچایا۔ رئیس وہ ہے جس نے مام کی ڈوبتی ساکھ اور انکے شوہر کا ڈوبتا کاروبار بچایا۔ مرے باپ کے خاندان میں آج تک کسی نے ٹی وی کے لیے کام نہیں کیا میں نے وہ بھی کر دیا لیکن مجھے بدلے میں بس حقارت ملی۔ وہ آج بھی مجھے اپنا بیٹا کم اور اپنے بے وقار ایکس کی نشانی زیادہ سمجھتی ہیں، لیکن تم بہت جلد دیکھو گی رئیس کیا ہے اور کون ہے۔ مام کو انکی غلطی کا احساس ہونا چاہیے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا تھا۔ اب اس سے اگر بنگش خاندان کو کوئی فائدہ ملے گا تو وہ ہر فائدے کو خسارے میں بدلے گا۔

نایاب کو ایک لمحے کے لئے اس سے خوف آیا تھا وہ کوئی انتقام نہیں چاہتی تھی، اسے تو بس اپنے شوہر اور بیٹے کے

ساتھ ایک پر سکون گھر چاہیے تھا۔ وہ تو بس یونہی ساس اور بہو کا ایک جھگڑا بتا رہی تھی لیکن خیر... اس نے سر جھٹکا اور رئیس کے بازو پر سر رکھ لیا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا، آپ کو وہ سب ملے گا جس کے آپ حقدار ہیں۔"

رئیس چپ چاپ اسکے بالوں میں ہاتھ پھیر تا رہا۔ اس کا ارادہ تھا جو اس نے بنایا ہے وہی وہ تباہ کرے گا۔

★★★★★★★★★★

سہراب یمن کی گاڑی اس وقت لاہور کی سرحدوں میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑکوں پر بے تحاشا رش اور فضا میں پھیلی دھند کی وجہ سے اسے مری سے لاہور آتے آتے دیر ہو گئی تھی۔ اور اب بلاخر کوئی ایسی سڑک آئی تھی

جہاں رش قدرے کم تھا۔

"میں نے یزدان صاحب سے بات کی ہے اب کچھ دنوں تک میر اتبادلہ لاہور ہو جائے گا۔" اس نے گاڑی چلاتے ہوئے ساتھ والی نشست پر بیٹھے اسلان سے کہا۔ جواب ندارد۔ وہ موبائل پر کچھ دیکھ رہا تھا۔

"تمھیں اندازہ ہے کتنی بھاری فیس دی تھی میں نے لارنس کالج کی، تم نے اسے بھی چھوڑ دیا۔ پھر نمل میں تمہارا داخلہ کروایا تم نے اسے بھی لات مار دی۔ اب میں لاہور میں تمہاری ایک بھی بات نہیں سنوں گا۔" سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے اس نے حتمی انداز میں کہا۔ اسلان ہنوز اپنی بڑی بڑی آنکھیں موبائل پر گاڑے بیٹھا تھا۔ "اسلان ۔۔۔۔۔۔" سہراب نے ناگواری سے پکارا۔ "میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"مت کرو کوئی ضرورت نہیں؟"

"تم مجھ سے کیوں ناراض ہو؟"

"ناراض نہیں ہوں مجھے اس وقت کسی کی شکل نہیں دیکھنی چپ رہو بس۔" ٹکا سا جواب دیتے ہوئے اس نے

موبائل کی آواز بڑھا دی۔ یہ اشارہ تھا کہ اس سے بات نہ کی جائے۔ گاڑی میں جو آواز گونج رہی تھی وہ کچھ کچھ شناسا تھی۔

"آپ اس بار اپنی کتاب کی ساری کمائی ایک یتیم خانے کو دے رہے ہیں کیا آپ اپنی کتاب کی "قیمت" اور اسکی "بکری" سے واقف نہیں ہیں؟" موبائل کی سکرین پر دو لوگ نظر آرہے تھے۔ سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھا اپنی بلی کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا ہوا شاہ ویر اور اس سے سوال کرتا ہوا ایک آدمی۔

سوال پر شاہ ویر نے نگاہیں اٹھا کر سادگی سے اسے تکا۔ اسکی کتھئی آنکھیں دھوپ کی وجہ سے سیاہ رنگ میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ سرخ سپید رنگت پر سیاہ لباس پہنے وہ جاذب نظر لگ رہا تھا۔

"_ میرے نزدیک وہ انسان بہت بے وقوف ہے جسے یہ نہیں معلوم کہ اسکی قدر و قیمت کیا ہے۔ اور میرے

نزدیک میں بہت سمجھدار اور زیرک آدمی ہوں۔" اس نے بلی کو اٹھا کر اپنے کندھے پر لٹایا اور میزبان کے ساتھ کھڑا ہوا۔ "میں جانتا ہوں جس زمین پر میں کھڑا ہوں اس کی وسعت کیا ہے، جو آسمان میرے سر پر ہے اسکی چوڑائی کتنی ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میری کتاب کا کاروبار کتنا ہے۔" کیمرہ مین انکے دائیں اور بائیں چل رہے تھے، روشنی محض شاہ ویر کے چہرے پر تھی، اور بولتے ہوئے وہ جیسے نگینے اٹھا اٹھا کر انہیں تاج میں درست جگہ نصب کرتا جا رہا تھا۔ یہ منظر مزید چل پاتا کہ سہراب نے اسلان کے ہاتھ سے اسکا موبائل لے کر سکرین تاریک کر دی۔ خلاف توقع مزاحمت اس نے بھی نہیں کی۔ وہ بس لب بھینچ کر رہ گیا۔

"اگر تم بھی اپنی لکھائی پر اتنی محنت کر لیتے تو آج یوں کسی کے انٹرویوز دیکھ کر دل نہ جلا رہے ہوتے۔" گاڑی لعل یمن جانے کے راستے پر ڈالتے ہوئے سہراب نے کہا۔ اسلان بے بسی سے لب کاٹنے لگا۔ اسکے چہرے پر اب کے جھنجھلاہٹ تھی۔

"میں کبھی بھی اسکے جیسا نہیں بن سکتا تھا۔ کیا نہیں ہے ہے اسکے پاس؟ وہ میر کارواں ہے۔ اسکے آگے پیچھے لوگ

ہیں۔ایک دنیا جانتی ہے اسے،دنیا کی ہر اینجیو اسکے ساتھ کام کرنا چاہتی ہے لیکن وہ؟اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ماتھے پہ سیاہ پٹی پہن کر جب وہ کسی بھی مظلوم کے لیے انصاف مانگنے سڑک پر نکلتا ہے اسکے آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف لوگ ہوتے ہیں۔"ستائش تھی،پچھتاوا تھا کہ گلہ سہر اب سمجھ نہ سکا۔

"یہ سب اسکا کمال ہے۔وہ الگ انسان ہے اسکے پیچھے ایک مضبوط خاندان ہے۔جانتے بھی ہو اسکے ماموں کیا کرتے ہیں؟ایمبیسڈر ہیں اسکے بڑے تایا ڈی سی ہیں،ماں اس ملک کی سب سے دلدادہ اداکارہ بہن ماڈل بہنوئی صنعت کار۔اسکی راہیں شروع سے ہموار رہی ہیں۔"

"شاہ ویر کو ان سب کے نام اور کام کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔جہاں وہ کھڑا ہو اسکی حیثیت ہی الگ ہوتی ہے۔"اسلان نے اسکی بات کاٹی۔سہر اب نے مزید بحث نہیں کی۔اسے اس خاندان کے نام سے ہی چڑ تھی۔

"میں یہاں اسکی شان میں قلابے ملانے کے لیے نہیں بیٹھا نہ وہ میرا باپ لگتا ہے۔میں صرف یہ سمجھا رہا ہوں کہ وہ

ایک الگ انسان ہے۔اور تم دونوں کا یانرا الگ تھا وہ کرائم تھرلر لکھتا ہے تم محبت لکھتے تھے تمہارا اور اسکا کیا مقابلہ؟"

راستے میں ایک پھولوں کی دکان نظر آئی تو سہر اب نے گاڑی روک دی۔پھر اسکی طرف مصلحت آمیز انداز سے دیکھا۔

"اسلان تم اس سے مقابلہ مت کرو۔"

"میں اس سے مقابلہ نہیں کرتا میں جانتا ہوں میں کبھی بھی اسکے جیسا نہیں بن سکتا۔"

"بالکل وہ تمہارا پسندیدہ لکھاری جو ٹھہرا۔"گاڑی کا دروازہ کھولتے وہ باہر نکلا،پھر کچھ سوچ کر رکا۔کہنیاں شیشے پر جمائیں اور ٹھہر کر اسلان کو دیکھا۔"اگر تم آراہ سے اس بار ٹھیک طریقے سے بات کر لو تو شاہ ویر کی ہر کتاب کا ہر نیا ایڈیشن تمھیں تحفے میں دوں گا وعدہ۔"

اسلان نے استہزائیہ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور نشست پر ترچھا ہو کر سہراب کی آنکھوں میں جھانکا۔ آنکھیں میں کچھ تھا تو محض طیش۔

"پیسے زیادہ ہو گئے ہیں تو سڑک پر کھڑے بھکاریوں کی تعداد دیکھ لیں اور اگر پھر بھی کوئی نہ ملے تو میرا باپ شجاع یمن تو ہر وقت میسر ہے۔" وہ جس سرد لہجے میں بولا سہراب کے جبڑے اسی تیزی سے بھینچ گئے۔ "جو آدمی ایک عورت کی ملی ہوئی بھیک پر اولاد اور بیوی چھوڑ سکتا ہے وہ چھوٹے بھائی کی طرف سے ملا ہوا صدقہ خیرات بھی نہیں بخشے گا۔ یہ حربے ان پر آزمائیں جن پر انکا اثر ہوتا ہو۔" وہ رکا سہراب کی آنکھوں میں مطلوبہ طیش نظر نہ آیا۔ "چاچو اسکار۔" (the lion king فلم میں سمبا نامی شیر کے کردار کا دغاباز چچا جس نے اپنے بھائی کو مروادیا تھا اسکا نام اسکار تھا اور اسلان سہراب کو چڑانے کے لیے اسے اسی نام سے بلاتا تھا)

سہراب کئی لمحے وہاں کھڑے ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس بچے سے طاقت اور تعلق میں بڑا تھا چاہتا تو دو تھپڑ مار کر

اسکا منہ بند کروا دیتا، سزا دے دیتا مگر۔۔۔۔۔۔۔ نہیں مسئلہ اسکی زبان نہیں تھی مسئلہ احمد اسلان ولد شجاع یمن کا دل تھا جو برف ہو چکا تھا۔ کوئی تعلق کوئی جذبہ اس پر اثر ہی نہیں کرتا تھا۔

★★★★★★★★★★★★★★★

دبیز پردوں والے کمرے میں رات کی اس سیاہی میں لکڑی کے بھورے فرش پر دوزانو بیٹھی لڑکی آتش دان کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھے ہوئے مرد کو گردن اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں آگ کا عکس بن رہا تھا۔ کہانی دلچسپ تھی یا نہیں اسے نہیں پتا تھا مگر وہ اٹھ کر یہاں سے جا نہیں سکتی تھی، یہ جانا جان سے جانے کے مترادف تھا۔ آتش دان کی چٹختی لکڑیوں کی آواز میں لڑکی کی سرسراتی آواز ابھری۔

"اسلان شجاع یمن، اس لڑکے کو اپنی بہن سے نفرت کیوں تھی؟ وہ ساری دنیا سے ناراض کیوں تھا، اسے اپنے سگے خونی رشتوں سے کیا اختلاف تھے؟"

مرد نے گردن جھکا دی۔کافی دیر تک وہ یونہی بیٹھا رہا پھر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آئے دن خبروں میں سنتے ہیں فلاں فلاں کی طلاق ہو گئی۔فلاں عورت نے شوہر کے تشدد سے تنگ آکر خلع لے لی۔شوہر نے بیوی کی بدزبانی سے تنگ آکر دوسری شادی کرلی۔" وہ ہلکا سا ہنسا،طنزیہ تلخ مسکراہٹ۔"دنیا مرکزی کردار کو یاد رکھتی ہے۔دنیا کو یہ یاد نہیں رہتا کہ جو جوڑا الگ ہو گیا انکے بچے بھی تھے۔ٹوٹی شادی میں سب سے زیادہ مشکلات جنہیں پیش آتی ہیں وہ بچے ہوتے ہیں۔اسلان یمن وہی بچہ تھا۔اسکے دائیں بائیں مضبوط سہارے ہٹ گئے اور تیز طوفان میں وہ تنہا رہ گیا۔طوفان میں تنہا رہ جانے والے بقا کا سفر طے نہیں کر پاتے۔"

لڑکی مزید آگے ہو کر بیٹھی لڑکے نے گردن جھکائی۔نارنجی آگ انکے چہرے کے داہنے رخ جھلسا رہی تھی۔کہانی کے جھلسانے کا وقت شروع ہوا چاہتا ہے۔

★★★★★★★★★★★

"موجودہ وقت سے کئی برس قبل"

"شہر:کوہ مری"

"وقت:رات کے نو بجے۔"

پاکستان میں جب بھی کوئی جوڑا یا خاندان چھٹیاں منانے یا گھومنے کا منصوبہ بناتا ہے انکے ذہن میں سب سے پہلا خیال کوہ مری کا آتا ہے۔برف میں نہائی کھڑی یہ وادی سیاحوں کے دل میں گھر کرتی ہے۔اونچی نیچی ڈھلوانوں والی گلیاں اور برف سے اٹے ہوئے درخت آنکھوں کو لبھاتے ہیں۔"یمن خاندان" جو کہ لاہور کے رہائشی تھے ان دنوں مری کی سیر کو آنکلے تھے۔برف باری نے سارے مری کو کسی ہندو بیوہ کی طرح سفید چادر اوڑھا دی تھی۔سٹریٹ پولز،اور گھروں کی کی جلتی ہوئی بتیوں میں یہ منظر بے حد خوبصورت دکھائی دے رہا

تھا۔ کسی بنچ پر بیٹھے جوڑے کی گفتگو سنتے، کسی کیفے میں آتش دان کے گرد بیٹھے لوگوں کا گیت سنتے لکڑی کے ایک کاٹیج کارخ کرو تو بڑے سے حال میں اس وقت کئی لوگ جمع تھے۔ ایک جوڑا ناخوش سا بحث کرتا ہوا، دوستوں کا ایک جوڑا صوفے پر براجمان اس "بحث" کو ملاحظہ کرتا ہوا۔

"دل آرہ... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ مجھے امریکا سے جاب کی آفر آئی ہے اور یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔" آتش دان کے پاس ٹہلتا مرد بے حد ضبط سے کہہ رہا تھا۔ اسکی رنگت سانولی تھی نقوش عام سے۔ ہاں مگر اسکی ہیزل آنکھیں پرکشش تھیں۔

"ہر دفع دل آراہ ہی کیوں سمجھے؟" اسکے سامنے کھڑی اسکی بیوی بلند آواز میں بولی۔ "میں نے اپنی آدھی زندگی تمھیں دی ہے، شجاع۔ اب یہ میرا وقت ہے اب تمھیں چاہیے تھا کہ تم حوصلہ دو۔ یہ بچے صرف میرے نہیں ہیں۔ تم مردوں نے گھر کی ہر ذمہ داری کو عورتوں پر ہی کیوں تھوپنا ہوتا ہے؟" دبلی پتلی جسامت، بے تحاشا گوری رنگت اور تیکھے نقوش والی عورت نے تنک کر کہا۔ "میں پیرس جاؤں گی۔ یہ فیشن شو میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش رہا ہے تلوے گھسا دیے اس کے لیے اور تمھیں لگتا ہے میں اس سے دستبرداری دوں گی؟ تم بہت غلط کر رہے ہو۔"

شجاع ذرا دھیما پڑا اس نے ٹہلنا بند کیا اور اپنی بیوی کے قریب آکر رکا۔ "دیکھو دل آراہ... عورت صرف گھر گھرہستی کرتی اچھی لگتی ہے، تم پیرس جاؤ گی تو پیچھے ہمارے بچوں کا کیا ہو گا؟ اسلان کس طرح رہے گا؟ اور آراہ وہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے تم...."

"تم قربانی دے دو ہے ناں؟" اس نے تندہی سے اپنے شوہر کی بات کاٹی۔ اسکا چہرے غصے سے سرخ پڑ رہا تھا۔ تنفس پھول رہا تھا۔ "ہر بار دل آرا طارون ہی کیوں قربانی دے؟ ہر بار میرا کیریئر ہی کیوں قربان ہو؟ تم اپنی طرف سے کوئی ایفرٹس کیوں نہیں دکھاتے؟"

جواب میں اسکا شوہر کچھ کہہ رہا تھا کچھ سمجھا رہا تھا، لیکن اگر یہاں سے نظر اٹھا کر ذرا فاصلے پر دیکھو تو اسی کمرے

میں شیشے کی گلاس وال کے سامنے رکھے ایل شیپ صوفے پر دو مرد بیٹھے تھے۔یوں کہ ایک صاف رنگت اور خوبصورت نقوش والا لڑکا نیم دراز تھا۔اور اسکے پیر کمر سیدھی کئے بیٹھے سانولی رنگت والے لڑکے کی گود میں رکھے تھے۔سینے پر خشک میوہ جات کا پیالہ رکھا تھا جس میں سے وہ اپنے خشک میوہ نکال نکال کر کھا رہا تھا،ساتھ ساتھ سامنے بیٹھے اونچے لمبے لڑکے کو بھی دے رہا تھا۔ان دونوں کی آنکھیں پنڈولم کی طرح یہاں سے وہاں جھول رہی تھیں۔

جس تنفر اور طیش سے شادی شدہ جوڑا لڑتا ہوا نظر آ رہا تھا اسی سکون کے ساتھ وہ دونوں یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ان کی گہری دوستی لگتی تھی یوں جیسے دو جسم ایک جان، یا یوں جیسے کبھی کوئی غلط فہمی کوئی دراڑ انکو چھو کر بھی نہیں گزرے گی۔(واقعی؟)کافی دیر تک اسی طرح جھگڑا دیکھتے رہنے کے بعد نیم دراز لڑکے نے کہنا شروع کیا۔

”دیکھو ذرا انکو کیسے لڑ رہے ہیں اور پھر ہمیں دیکھو کیسی محبت پھوٹ رہی ہے کوئی کہے گا کہ ہم ان دونوں جانوروں کے بھائی ہیں؟یافث طارون کے انداز میں ناپسندیدگی تھی۔نوعمری میں اسکا چہرہ مزید پرکشش نظر آ رہا تھا۔

سہر اب نے اسکے بڑھے ہوئے ہاتھ سے بادام لئے اور ایک بار پھر غور سے اپنے بھائی بھابی کو دیکھنے لگا۔”وہ دونوں میاں بیوی ہیں دنیا کے سب سے بڑے جانور، اور ہم دوست ہیں دنیا کے سب سے امن پسند پرندے۔فرق ہے طارون بہت فرق۔“وہ اب بھی گردن ترچھی کئے انکو دیکھ رہا تھا۔چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا ہاں البتہ ان دنوں اسکے چہرے پہ وہ سختی اور بے زاری نہیں تھی جو مستقبل کے سہر اب کے چہرے پر تھی۔

”بھائی کو بھی کس ناگ نے کاٹا تھا جو دل آراہ جیسی ناگن سے شادی کرلی۔“اس نے اضافہ کیا۔

”آپا کے اسکرو بھی ڈھیلے تھے جو اسے شجاع یمن سے محبت ہو گئی۔“سہر اب چپ رہا۔یافث مسکرایا،لیٹے لیٹے باچھیں کھول کر مسکرایا۔”سوچو اگر میں عورت ہوتا اور تمہاری بیوی ہوتا تو؟“

سہر اب نے گردن نہیں موڑی۔”اگر تم میری بیوی ہوتے تو تم اگلے دن عدالت میں میرے خلاف گھریلو تشدد

کا مقدمہ دائرے کرتے۔ ناک کی ہڈی ٹوٹی ہوئی، بازوؤں پر نیل، اور کمر پر بیلٹ کے نشان کیا اب بھی ایسی کوئی خواہش باقی ہے؟" اب کے اس نے گردن موڑ کر یافث کو دیکھا وہ ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔

"تم چاہے میرے سر کو قلم کر دو میں تمھارے خلاف کبھی عدالت نہیں جا سکتا۔"

"جانا بھی مت راستے میں کتے کی موت مروا دوں گا۔"

"تمہاری دوستی میں مارا گیا تو بازی مات نہیں۔"

"پہلے ان دونوں کو چپ کرواؤ ورنہ آج ان میں سے ایک کے قتل میں تمھیں فریم کرواؤں گا۔" سہراب بگڑا۔

یافث نے اسکی بات پر کڑوا منہ بنایا تھا لیکن خود کو بولنے سے باز نہیں رکھ سکا۔ "ویسے ان دونوں جانوروں کو سمجھاؤ اس طرح اگر میرے سامنے لڑتے رہیں گے تو میں شادی کے بارے میں کیا خاک سوچوں گا؟ میرے دل سے تو

محبت کی شادی اور لڑکی کا خیال ہی ختم ہو رہا ہے۔" اسے تو بھئی صدمہ ہی لگ گیا تھا۔

سہراب نے ناک سے مکھی ہٹائی۔ "ان دونوں کو دیکھنے کے بعد میرا دل تو زندہ رہنے کو نہیں چاہتا تم شادی کی بات کر رہے ہو، اور یہ ہٹاؤ اپنے پیر تمھیں گود نہیں لیا ہے۔" اس نے کہتے ساتھ اسکے پیر دور ہٹائے تھے لیکن وہ یافث ہی کون جو مان جاتا اس نے دوبارہ اپنے پیر اسی طرح اسکی گود میں دھر دیے اور رشوت کے طور پر اسے چند اضافی بادام دیے۔ پس منظر میں اب بھی ان دونوں کے لڑنے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں جنہیں سن کر پلنگ پر لیٹے دونوں بچے اٹھ گئے تھے۔ اور اب انکا رونا بھی بے سرے راگ کی طرح منظر میں شامل ہو گیا۔ خاندانی تفریح بے سرے راگ، جھگڑے کی آواز میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"یار اب ان جانوروں کے لئے کوئی آئے گا یا نہیں؟" یافث بے اختیار کراہا۔

"جنگ ختم کرنے کے لئے امن کے پرندوں کو میدان میں آنا ہوتا ہے۔" سہراب یمن اسکے پیر اپنی گود سے

ہٹاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ پرندہ اب نہیں اٹھ سکتا انکے جھگڑے میں ہمیشہ میرے پر کاٹے اور جلائے جاتے ہیں۔" اسکے ٹکے سے جواب کی پرواہ کئے بغیر سہر اب اب سنجیدگی سے پلنگ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اسکے برداشت کی ہر حد تب ختم ہوتی تھی جب بات "بچوں" پر آجاتی تھی۔

"طلاق دے دو مجھے یہ آسان ہے ناں تمھارے لیے دو طلاق۔" دل آرا اب چیخ رہی تھی۔ جواباً شجاع اس سے زیادہ بلند آواز میں چلایا۔ سہر اب نے پلنگ پر بیٹھی رونی صورت بناتی آراہ کو گود میں اٹھالیا۔ ساتھ ہاتھ بڑھا کر اسلان کو اپنے قریب کیا اور اسے بھی اپنے بازو کے حلقے میں لیا۔

تمھیں مجھ سے اور بچوں سے زیادہ اہم اپنا کیریئر لگتا ہے؟" شجاع دھاڑا تھا۔ آراہ سہم کر اپنے چچا کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ پلنگ پر گھٹنوں کے بل بیٹھے، سہر اب کے بازو کی گرفت میں موجود اسلان خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ جب یافث نے اسکے عقب سے آکر اسے بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔ اسلان نے نامحسوس انداز میں یافث کے بازو کے گرد اپنے دونوں ہاتھ باندھ لیے۔ اسکے دل کو کچھ ہوا۔

"بھائی بھابی اب بس بہت ہو گیا۔" سہر اب کی سنجیدہ آواز پر ان دونوں نے مڑ کر دیکھا تھا۔ "آپ دونوں کو کوئی نہیں روک رہا بھائی آپ امریکا جائیں اور بھابی آپ پیرس چلی جائیں۔"

"اور بچے۔۔۔۔؟ بچوں کا کیا ہو گا؟" شجاع تندہی سے بولا تھا۔ البتہ اسکی آواز بلند نہیں تھی۔ سچ تھا کہ سہر اب کے سامنے وہ دونوں بول نہیں پاتے تھے۔

"بچوں کی پرواہ ہے آپ کو؟ واقعی؟ اتنی فکر دیکھ کر تو میری آنکھیں بھر آئیں۔" اب کے یافث بولا اسکی آواز میں تمسخر تھا شجاع نے پہلو بدلا، دل آرا کلس کر رہ گئی۔ "صبح کے نکلے ہوئے رات دیر تک آپ دونوں گھر آتے ہیں۔ بچے بیمار ہیں تو یافث ہے ناں، بچوں کو بھوک لگی ہے تو سہر اب جو ہے۔ رات کو پڑھتے ہوئے بھی ہم انکو

کندھے پر لٹکا کر پھر رہے ہوتے ہیں کیونکہ آپ دونوں کو گھر آنے کا وقت نہیں ملتا۔"

"تو کیا کریں؟ جاب چھوڑ دیں؟"

"بچوں سے تم دونوں کا بھی تعلق ہے اگر ذرا سا کام کر لیا تو کونسی قیامت آگئی؟"

دونوں میاں بیوی چڑھ دوڑے۔ یافث نے مزید کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر سہراب نے اپنی گردن کے گرد آراہ کے بازو سختی سے بندھتے محسوس کر لیے تھے سو اس نے یہ قصہ ختم کرنا مناسب سمجھا۔ وہ معصوم ذہنوں پر پڑتے اثر دیکھ رہا تھا۔

"بس اب بحث نہیں چاہیے مجھے۔ آپ دونوں جہاں جانا چاہتے ہیں چلے جائیں بچے میں اور یافث سنبھال لیں گے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا واپسی پر اپنے اختلافات ختم کر کے آئیے گا میرے لیے آپ کی اس سڑی ہوئی شادی سے زیادہ اہم بچے ہیں۔ اور میں نہیں چاہتا ان پر کوئی برا اثر پڑے۔" وہ ہنوز آراہ کو سینے سے لگا کر بیٹھا تھا۔ شاید وہ ڈری ہوئی تھی۔ اسلان یک ٹک پلک جھپکے بغیر اپنے ماں باپ کو دیکھ رہا تھا۔

اسلان شجاع یمن نے ماں باپ کی کئی قسمیں دیکھی تھیں۔ کچھ جو اپنے بچوں کو اسکول چھوڑنے اور لینے آتے تھے، کچھ جو انہیں گھمانے لے جاتے تھے، کچھ وہ جو انہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتے تھے، رونے پر انہیں سینے سے لگاتے تھے اور انکے ہنسنے پر انکے ساتھ ہنستے تھے۔ اسکے ماں باپ بہت مختلف تھے۔ وہ ساتھ ہوتے تو لڑتے، ان میں سے کوئی ایک گھر ہوتا تو دوسرے کے متعلق مغلظات بکتا۔ ایک بے جوڑ شادی کا حرجانہ وہ دونوں بچے اپنی ذہنی صحت مار کر ادا کر رہے تھے۔

"ڈیڈ...." بلاخر اس نے اپنے باپ کو پکارا تھا۔ سب مڑ کر اسکی طرف دیکھنے لگے۔ اسکو گود میں لیے کھڑے یافث نے اسے پلنگ پر بٹھایا۔ اسکی بڑی بڑی آنکھوں میں امید تھی۔ "کیا آپ دونوں ہمارے ساتھ نہیں رہو گے؟ آراہ آپ کو بہت مس کرے گی۔"

دونوں ماں باپ کا دل ایک ساتھ پگھلا۔

وہ صاف صاف نہیں کہہ سکتا تھا کہ "وہ" ان دونوں کو بہت یاد کرے گا۔ دل آراہ آگے بڑھی اور محبت سے اسلان کو گلے لگایا۔ شجاع اسکی دائیں طرف آکر بیٹھا اور محبت سے بیٹے کے بال سہلائے۔

"ہم جلدی آجائیں گے۔"

تسلی، آہ اسے تسلی نہیں ساتھ چاہیے تھا۔ جو شاید ہمیشہ کے لیے چھننے والا تھا۔

★★★★★★★★★★

"موجودہ دن"

لعل یمن لاہور کے ایک نسبتاً بہتر علاقے میں واقع اس گھر کا نام تھا جسے سہراب، عالمگیر اور شجاع کے والد افتخار یمن نے بنایا پھر دل آراہ طارون اور شجاع یمن نے محبت کی مثال کے طور پر سجایا۔ کالج سے لے کر یونیورسٹی تک اور پھر یونیورسٹی کے درمیان تک ان دونوں کی محبت کے چرچے آدھے لاہور میں ہوتے رہے۔ جب محبت کے نام پر ہر حد پار ہوئی، غلط و صحیح کی تفریق نہ رہی، جب ملاقاتیں عروج پر پہنچیں تب ان دونوں نے شادی کرنے کا سوچا۔ لیکن جن جوڑوں نے شادی سے پہلے حرام کی لذت چکھ لی ہو, حلال پھر انکے دلوں پر بہت مشکل سے اترتا ہے۔ دل آراہ اور شجاع کی شادی ایک بدترین شادی ثابت ہوئی اور شادی کے بارہ سال بعد انکے درمیان طلاق ہو گئی۔ تعلق ٹوٹ گیا، لیکن ریت بجری اور کنکریٹ کے گھر یونہی نہیں ٹوٹتے۔ لعل یمن اپنے سینے میں کئی راز سمیٹے خاموشی سے کھڑا تھا۔

سہراب نے گاڑی لاک کی اور اسلان کے ساتھ چلتا ہوا اندر آیا۔ لعل یمن اندرون لاہور کے گھروں کی طرز پر بنا تھا۔ بھوری سرخ ابھری ہوئی اینٹوں والی دیواریں، لکڑی کی گرل والی بالکنیاں، چپس کا سیاہ فرش اور روش کے

دونوں اطراف میں بچھے گھاس کے قالین۔لان میں دائیں طرف ایک تناور درخت کھڑا تھا جس سے سبز، سرخ، نارنجی بوتلیں لٹک رہی تھیں۔ بوتلوں کے گرد فیری لائٹس لپٹی تھیں، اور اسی درخت کے نیچے بھاری لکڑی کی میز اور کرسیاں لگی تھیں۔ لعل یمن خوبصورتی کا دوسرا نام تھا۔ یہ گھر پہلے بھی خوبصورت تھا لیکن سہراب کے مری جانے کے بعد جب اسکے تمام مالکانہ حقوق عالمگیر کو ملے تو اس نے اس گھر کی خوبصورتی کو مزید نکھار دیا۔ زینوں کی گرل، کھڑکیاں، بالکنی کی لکڑی نئی پالش کے نکھر گئی۔

سہراب اور اسلان چلتے ہوئے خاموشی سے اسی درخت کی جانب چلے آئے۔ اِنارا نے انہیں دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز تیز قدم لیتی ہوئی انکی طرف چلی آئی۔ اسکا چہرہ خوشی سے تمتمارہا تھا وہ قریب آئی تو سہراب نے اسے کندھے سے لگا کر اسکے بال سہلائے۔

"میں نے آپ کو بہت یاد کیا چاچو۔"

"بیٹا دن کا آدھا حصہ تو تم فون پر میرے ساتھ رہتی ہو یاد کب کیا۔" سہراب نے نرمی سے اسے الگ کیا۔ اسکے لبوں کے کنارے مدھم مسکراہٹ تھی جو اس سارے وقت میں پہلی بار نظر آئی تھی۔

"قدر کیا کریں میری محبت کی ہنہہ۔" سر جھٹک کر کہتے اس نے اسلان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ چہرے پر وہی پرخلوص مسکراہٹ قائم تھی۔ انداز میں ہلکی جھجھک۔ "کیسے ہو بھائی؟"

"جیسا پچھلی بار تھا اب بھی ویسا ہوں، کوئی سرخاب کے پَر نہیں لگ گئے مجھے۔" اس نے ہاتھ نہیں تھاما۔ مناسب لہجے میں کہتا وہ آگے بڑھ گیا۔ آراہ کے گلے میں گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی، آنکھوں کی جوت ماند پڑ گئی تھی لیکن وہ پھیکا سا مسکرائی۔ سہراب اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اسکے ساتھ چلتے ہوئے میز کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اس سے کچھ چھوٹے موٹے سوال بھی کر کے اسکا دھیان بھی بٹا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ اسلان کے ساتھ درخت کے کٹے ہوئے تنوں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سیاہ ہائی نیک سوئیٹر کے

ساتھ سیاہ ہی پینٹ پہنے اسلان بے زار دکھائی دے رہا تھا۔ آراہ اسکی بے زاری سے یکسر بے نیاز مسلسل اس سے کچھ کہہ رہی تھی، اور اسلان اپنے چچا اور ماموں کی نظروں کی وجہ سے ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی آراہ کو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا، یہ آنکھیں اسے بہت کچھ یاد دلاتی تھیں۔ اور اس وقت وہ کسی تلخ یاد کو اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنانا چاہ رہا تھا۔

"تمھیں پتا ہے بھائی مجھے جہاں نوکری ملی ہے ناں وہ لاہور کا بہت بڑا جیولری بنانے والا اسٹور ہے۔" دور حاضر کی لڑکیوں کی طرح آراہ مشکل مشکل الفاظ یاد کر کے نہیں بولتی تھی۔ اسکی زبان سادہ رہتی۔ jewelry making shop اسکے لیے زیور بنانے والا اسٹور تھا، فیشن ہاؤس اسکے لیے کپڑے بنانے والی دکان تھی۔

"مس انارا طارون، میں تمہاری کامیابیوں میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔" اسلان نے اسکی باتوں کے جواب میں اکتا کر کہا تھا۔ انارا طارون پر زور دیا۔ دل آراہ جعلی فیمینسٹ تھی۔ یعنی وہ فیمنسٹ جسے حقوق "معاشرے" سے نہیں "مردوں" سے لینے تھے۔ اور اسکے حقوق لینے میں جنسی تشدد، گھریلو تشدد، یا پھر کم عمری کی شادی جیسے موضوعات کو چھوڑ کر جوتا خود ڈھونڈنے اور موزا خود پہننے جیسے موضوعات شامل تھے۔ اس نے آراہ کی تحویل ملنے کے بعد ایڑھی چوٹی کا زور لگا کر اسکے نام سے یمن ہٹا کر طارون لگا دیا تھا، اسلان کے متعلق بھی اسکا ارادہ یہی تھا لیکن اسکی تحویل جس کے پاس تھی اس آدمی سے آدم خور بھی خوف کھاتے تھے۔ دل آراہ تو پھر کل کی ڈائن تھی۔

"اپنی معصومیت اور کامیابیوں کے لیے تمھارے پاس گھر کے دو مرد کم پڑ گئے ہیں؟"

وہ سلگ کر بولا اب کے آراہ کی رنگت واضح طور پر پھیکی پڑی۔ ان سے ذرا فاصلے پر گھاس کے قطعے پر بیٹھے سہر اب نے اسکو دیکھا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے پوچھ رہا تھا آل گڈ؟

انارا نے اپنا انگوٹھا بلند کر کے مسکرا کر اسے دیکھا اور سب صحیح ہونے کا اشارہ کیا سہراب گو کہ مطمئن نہیں ہوا لیکن اس نے رخ پھیر لیا تھا۔ آراہ اب بھی اسلان کو دیکھ رہی تھی جو اب اپنا موبائل نکالے اس پر بلاوجہ انگوٹھے چلا رہا تھا۔ اسکے بڑے بڑے ہاتھوں میں موبائل ایک انوکھی چیز لگ رہا تھا۔ آراہ بار بار کچھ کہنے کو منہ کھولتی لیکن پھر

چپ کر جاتی۔ اسلان یوں بیٹھا تھا جیسے اسے کوئی پرواہ ہی نہ ہو کہ اسکے سامنے بھی کوئی بیٹھا ہے جو اس سے بات کرنا چاہتا ہے، جو اسکا خونی تعلق ہے۔ اسے تکلیف ملی تھی اب وہ بھی وہی تکلیف واپس لوٹا تا تھا۔ آراہ نے اپنا گلا کھنکھارا، ہمت مجتمع کی اور ایک بار پھر اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔

”بھائی... تمھیں پتہ ہے جب زیور سازی کا یہ کورس پورا ہو جائے گا تو میں۔۔۔۔۔۔“

”انارا طارون، کیا تم پلیز اپنی بکواس بند رکھ سکتی ہو؟“

وہ مدھم سا غرایا۔ آراہ دم سادھ گئی۔ وہ منہ پھیر لیتا تھا، کڑوے جواب دیتا تھا لیکن ایسی سختی؟ اس نے کبھی ایسی سختی تو کبھی نہیں دکھائی تھی۔ یہ کڑواہٹ نہیں نفرت تھی۔

”تم بار بار اتنی حقارت سے میرا نام کیوں لیتے ہو؟ ہر بار میرے نام میں طارون جوڑ کر کیا جتانا چاہتے ہو؟“ وہ با مشکل خود کو رونے سے باز رکھ سکی۔ اسلان نے موبائل میز پر پٹخنے والے انداز میں رکھا اور دونوں کہنیوں پر زور دیتے آگے ہوا۔

”کیونکہ میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے نام کے ساتھ میرے خاندان کا نام نہیں آتا۔ تم ممی کی بیٹی ہو، میری بہن نہیں۔ میں تمھیں بہت واضح طور پر جتا رہا ہوں کہ تم اس عورت کی بیٹی ہو جو ڈیڈ کو چھوڑ کر اپنے کسی بوائے فرینڈ کے پاس چلی گئی۔“

”وہ ہماری ماں ہیں بھائی۔“

”پیدا کر دینے سے کوئی ماں نہیں بن جاتی، وہ تمہاری ماں ہے تم رہو اسکے ساتھ، جوڑو اپنا نام اسکے نام کے ساتھ کیونکہ اگر مجھے ماں کی ضرورت ہو گی تو میں دل آراہ طارون جیسی عورت کے پاس نہیں جاؤں گا۔“ وہ تنفر سے کہتا رہا۔ ”مجھے نفرت ہے تم سے۔ تمہاری وجہ سے چاچو مجھے اگنور کرتے ہیں، ماموں اور ممی نے تمہاری کسٹڈی مانگی، ڈیڈ تمھیں نیویارک بلواتے ہیں اور میں؟ ہر کوئی تمھارے لیے مجھے پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔“

آراہ خاموشی سے اسے سنتی رہی، اسے سننے کی عادت ہو چکی تھی۔ اسلان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی کا یہ رویہ برداشت کر لیتی اگر وہ شروع سے ایسا ہوتا لیکن آراہ کو اچھی طرح یاد تھا اسلان اس سے ملنے کے لیے آجایا کرتا تھا، وہ دونوں باتیں بھی کرتے تھے، وہ آراہ کو اپنی روداد سناتا اسکی سنتا بھی تھا۔ پھر چند سال پہلے کچھ ہوا تھا اور ۔۔۔۔۔۔۔ اور اس دن کے بعد سے اسلان کی ناپسندیدگی نفرت بن گئی۔ وہ اسی نفرت کو سینے میں بھرے آگے بڑھ گیا لیکن آراہ کا کیا؟ وہ زندگی کے انہی چند خوشحال سالوں میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ اور اب بس اسے انہی سالوں میں واپسی چاہیے تھی۔ افسوس کہ انسانوں کے پاس اختیار کم ہوا کرتے ہیں۔

"مجھے ہر ماہ یہاں تم سے ملنے کے لیے آنا پڑتا ہے کیوں؟ تمھیں کیا لگتا ہے میں تمھارے لیے آتا ہوں؟" وہ رکا، اس کی زخمی آنکھوں میں دیکھا اور پھر۔۔۔۔۔ "مجھے .... تم .. سے .. نفرت ہے۔" اس نے چبا چبا کر ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ "اور میں بہت جلد تم سب کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

چند لمحوں کے لیے آراہ کچھ کہہ نہ سکی۔

"تم کیا کرنے والے ہو؟" بہت دیر بعد وہ بولی تو اسکی آواز بہت ہلکی تھی۔ آنکھوں میں خوف ہلکورے لے رہا تھا۔

اسلان کے جبڑے یونہی تنے رہے۔

"میں یہ ملک چھوڑ رہا ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔"

وہ بس ٹکر ٹکر اسلان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا تھا ایک دن آئے گا جب اسلان اسکا سرپرست ہونے کی حیثیت سے اسے اپنے ساتھ رکھے گا، اور پھر کوئی عدالت اس سے اسکا واحد خاندان نہیں چھین سکے گی لیکن جو وہ کہہ رہا تھا وہ انارا طارون نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

"پلیز اگر تمھیں مجھ سے ذرا بھی محبت ہے تو اگلی دفع مجھے اور چاچو کو یہاں نہ بلوانا، میں تھک گیا ہوں روز روز کے اس ڈرامے سے۔" بے زاری اور کوفت سے کہتے ہوئے وہ اٹھا جب انارا نے کچھ کہا اور اسکا سارا وجود ایک لمحے کے

لیے منجمند ہو گیا۔

"I am seeing someone "

اسلان نے بے یقینی سے گردن موڑ کر اسکو دیکھا تھا۔کچھ تھا جو جسے بری طرح چبھا تھا کچھ تھا جس نے اسے غیر آرام دہ کیا تھا۔کچھ تھا کہ اسکا دل کیا وہ کہیں آگ لگا دے۔وہ وضاحت طلب نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

"دو سال ہونے والے ہیں۔میں اسے بہت پسند کرتی ہوں بھائی۔" اسکا دل تیز رفتار سے دوڑ رہا تھا سانس اتھل پتھل ہو رہی تھی۔مگر وہ کہہ دینا چاہتی تھی۔"وہ میرا رشتہ لانا چاہ رہا ہے لیکن میں اسے پہلے تم سے ملوانا چاہتی ہوں۔"

"کون ہے وہ؟" کرسی پر جمے اسکے مضبوط ہاتھ کی رگیں پھول رہی تھیں۔کوئی طیش تھا جو اسکے رگ وپے میں سرایت کر رہا تھا۔اس نے دانت پر دانت جما کر ضبط کرنے کی کوشش کی۔گو کہ ان دونوں کی پرورش خاصے کھلے ماحول میں کی گئی تھی مگر پھر بھی اسلان سے طیش قابو نہ ہوا۔

"تم اس سے مل لو،وہ بہت اچھا ہے کیا تم پلیز اس سے ملو گے؟"

اسلان سمجھ نہیں پایا اسے غصہ آرہا تھا؟برا لگ رہا تھا؟کیا تھا یہ کونسا احساس تھا جس کے تحت وہ اس آدمی کا گلا دبا دینا چاہتا تھا۔یا شاید وہ آراہ مزید سوال کرنا چاہ رہا تھا۔

"اس نے کہا وہ رشتہ لائے گا اور تم نے اعتبار کر لیا؟" وہ کہنا یہی چاہتا تھا مگر انا آڑے آگئی۔کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا۔پھر بے نیازی سے شانے اچکائے۔"بھاڑ میں جاؤ تم،اور بھاڑ میں جائے وہ۔جہنم میں جائے یہ تعلق۔"

"وہ بہت اچھا ہے بھائی۔وہ کہتا ہے میں ایلسا ہوں اور۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ تیز تیز کہنے لگی۔

"بالکل سہی کہتا ہے وہ۔۔۔۔۔" کرسی کے ہتھے پہ دونوں ہاتھ جمائے وہ آگے کو جھکا۔"ایلسا کرسڈ تھی۔اس

عورت نے اپنی ہی بہن کا دل برف کر دیا تھا تم بھی تو وہی ہو۔" اسکی آواز میں چھلکتی نفرت نے آراہ کا اگلا ہر لفظ زبان پر ہی روک دیا۔ اسلان اب اٹھ کر دور جا رہا تھا آراہ کتنے ہی منٹ اسکی پشت کو گھورتی رہی۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ میز پہ دھرا اپنا موبائل اٹھایا اور کسی کو پیغام بھیجا۔

"تم مجھے ایلسا کیوں کہتے ہو حالانکہ وہ تو کرسڈ تھی؟"

وہ میسج چھوڑ کے بے تابی سے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ اور اگلے ہی لمحے اسکے موبائل کی سکرین جل کر بجھی۔ آراہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ پیغام کھولا۔

"ایلسا کبھی بھی کرسڈ نہیں تھی وہ بس اپنی طاقت سے خوف زدہ تھی۔ اس نے کبھی اپنے خاندان کا برا نہیں چاہا۔ الگ ہونا کرس نہیں ہوتا۔"

پیغام بس یہیں تک تھا، اسکا دل شدت سے چاہا تھا کہ دلجوئی کا یہ سلسلہ کاش دراز ہوتا۔ مگر سامنے والا لکھاری تھا اتنا لکھے گا جتنا وہ چاہے گا۔

"میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں تم کب آؤ گے؟"

لفظوں نے کئی سرحدیں پھلانگیں، کئی ملک گھومے، کئی سمندر دیکھے، اور پھر امریکا کے شہر نیو یارک کے ایک کیفے میں بیٹھے لڑکے کے موبائل پر نوارد ہوئے۔ وہ کوئی کتھئی آنکھوں والا بے حد خوبصورت، اور پر کشش نوجوان تھا۔ ایک ہاتھ میں کافی کا کپ تھامے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر کچھ محفوظ کرتے اس نے موبائل اٹھایا۔

"تم چاہے مجھے اپنی سوتیلی محبت سمجھو لیکن میں تو تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔ حکم کرو کب آؤں؟"

"تمھارے کام کا حرج نہیں ہوگا؟"

"یہاں محبت داؤ پر لگی ہے میں کام دیکھتا رہوں؟"

"میں واقعی تمھیں مس کر رہی ہوں۔"

"رہنے دو ایک شہر میں رہتے ہوئے ہمارا long distance رہتا ہے۔"

آراہ ہلکا سا ہنسی۔"کوئی حل نکالو ناں۔"

"حل ایک ہی ہے تم تین بار میرے لیے اقرار نامہ دو اور پھر میں دیکھتا ہوں یہ لانگ ڈسٹنس کیسے ختم نہیں ہوتا۔"میسج بھیجتے ہوئے وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ آراہ ٹائپ کرتی تو وہ اسکی پروفائل دیکھنے لگتا، پھر لکھتا پھر پروفائل دیکھتا۔"پھر میں دیکھتا ہوں کون دنیا، کون چچا، کون سی ظالم پھپھی۔"

"تم اپنا کام کر لو، میں بعد میں بات کرتی ہوں۔"

وہ مسکرا رہی تھی۔ دل سے بوجھ سرکنے لگا۔ شاہ ویر بنگش کا ساتھ انارا طارون کی زندگی کا وہ قصہ تھا جسے وہ سنہری لفظوں میں لکھتی تھی۔ واضح، بے حد خوش خط۔

★★★★★★★★★★★★

جس وقتِ انارا اور اسلان یمن آپس میں گفتگو کر رہے تھے عین اسی وقت ان سے ذرا فاصلے پر پتھریلی روش کے دائیں طرف بچھی گھاس پر انگیٹھی جل رہی تھی۔ یافث دہکتے ہوئے کوئلوں پر رکھی سیخیں پلٹ رہا تھا، سہراب چھوٹی چھوٹی بوٹیوں کو سیخ میں پھنسا رہا تھا۔ اسکے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ یافث بار بار کچھ کہنے کا ارادہ کرتا پھر رک جاتا۔ اسکی یہ مشکل سہراب نے آسان کر دی۔

"آراہ کا وزن دیکھ رہے ہو؟ اگر تم اپنی بے کار کی مصروفیات ترک کر کے اس پر دھیان دینا شروع کر دو تو اس بچی کی صحت بہتر ہو سکتی ہے۔ کل جب اس کا رشتہ ہو گا اور بات اسکے وزن کی وجہ سے نہ بن سکی تو تم جانتے ہو اس پر کیا گزرے گی؟"سہراب ہر شے میں کاملیت ڈھونڈتا تھا اسے یہاں بھی وہی چاہیے تھی۔

"آراہ اکیس سال کی ہے اور۔۔۔۔۔۔۔" یافث نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگلے دوماہ میں وہ بائیس سال کی ہو جائے گی۔" سہراب نے اسی دوٹوک انداز سے کہا۔ سیخ میں گوشت کا ٹکڑا ابھی اسی جارحیت سے پھنسایا۔ "اسکے ماں باپ کی جگہ ہم ہیں اور میں چاہتا ہوں اسکی شادی جلد کر دی جائے۔"

یافث نے گہری سانس لی، بازو سینے پر باندھے اور تندہی سے اسے دیکھا۔ فضامیں باربی کیو کے "جلنے" کی بُو شامل ہو رہی تھی۔

"اگر ایسی بات ہے پھر اسلان کے گریڈز بھی دیکھو، کیا کیا ہے اس نے پچھلے دو سالوں میں؟ وہ دو سالوں سے اپنے ماسٹرز میں سپلیاں لے رہا ہے۔ کتنے ادارے تم بدل چکے ہو کتنی بار اسے اسموکنگ کرتے ہوئے میں نے خود دیکھا ہے اور کتنی بار وہ ۔۔۔۔۔۔۔۔" یافث کہتے کہتے رکا۔ ایسے جیسے ہچکچایا ہو۔ "وہ اب بھی اسلام آباد جاتا ہے۔ اور وہ آج بھی "اسے" نہیں بھولا۔"

سہراب تھم گیا۔ وہ واقف تھا مگر کسی اور سے یہ سننا الگ بات تھی۔ کتنی ہی دیر وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔

"تم جانتے ہو اسکا وہاں جانا کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے؟"

"یہ اسکا اپنا فیصلہ ہے۔ میں اسے منع نہیں کر سکتا۔" بہت دیر بعد وہ سنبھل کر بولا۔

سنہرا گوشت اب سیاہ ہو رہا تھا لیکن وہ دونوں آپس میں بحث کر رہے تھے۔

"بالکل اسی طرح آراہ کا وزن اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ وہ دو سال کی بچی نہیں ہے میں اسکے پیچھے پیچھے نہیں گھوم سکتا۔ یہ اسکا وقت ہے اسے چاہیے کہ اپنے فیصلے خود لے۔ میں اسے ایسے فیصلے لینے کے لئے ہرگز مجبور نہیں کروں گا۔" جو وہ گھوم کر آگے آیا سہراب کی بے تاثر آنکھوں میں دیکھا۔ "وہ فیصلے جو اسے تین سال کے لیے گھر میں قید کر دیں۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا تھا۔ لعل یمن کی فضاؤں میں اب تنفر اور طیش بھی پھیل چکا تھا۔

سہراب اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ "تم اگر یہ سب کہہ کر مجھے یہ بتانا چاہتے ہو کہ تمھیں آراہ اور اسلان کی پرواہ ہے تو تم بہت غلط ہو۔ تمہارے مرتے ہوئے ماں باپ نے غلطی سے کچھ جائیداد آراہ کے نام کر دی تھی اور اب اسکی تحویل سے لے کر اسکا خیال سب محض دولت ہتھیانے کے حربے ہیں۔"

کئی سال قبل جو دو جسم ایک جان تھے آج کئی سال بعد وہ ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے تھے۔ دو دوستوں کے درمیان کیا آگیا تھا؟

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ اسلان پر تمہارا بس نہیں چلتا اور آراہ۔۔۔۔۔" اسکی زبان کو جانے کیوں لقوہ لگا تھا۔ چہرہ سرخ ہوا۔ "وہ کسی سے فون پر باتیں کرتی ہے اور وہ باتیں کسی مرد سے ہوتی ہیں۔"

اگر یافث کو لگا تھا کہ سہراب کوئی شدید ردعمل دے گا تو ایسا نہیں ہوا۔ وہ اب بھی انہی سپاٹ سنجیدہ آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایسے جیسے کہہ رہا ہو کچھ نیا بتاؤ۔

"تمہاری بھتیجی کسی کے "ساتھ" تعلق میں ہے۔" یافث نے زور دے کر کہا۔ سہراب اسکے آگے سے گزر کر انگیٹھی کی طرف آیا۔ جلی ہوئی سیخیں اتار کر میز پہ ایک طرف رکھیں۔ اور پھر پلٹ کر اسے دیکھا۔

"5 جانتا ہوں۔" مدھم اعتراف۔ "دو سال ہو چکے ہیں تمھیں اب پتا چلا ہے کیونکہ تم نے اب غور کیا ہے مجھے دو سال سے اسکا بدلا ہوا چہرہ اور انداز نظر آرہے ہیں۔" اس نے تازہ سیخیں دہکتے ہوئے کوئلوں پر رکھیں۔ یافث بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "میں یہ معاملہ دیکھ لوں گا۔"

"مجھے جیسے اندازہ ہوا میں نے تمھیں بتادیا اور تم۔۔۔۔۔ تم نے مجھ سے اتنی بڑی بات چھپائی؟"

"میں تمھارے باپ کا نوکر یا تمہارا زرخرید غلام نہیں ہوں جو تمھیں ہر بات بتائے۔"

وہ اب بے نیازی سے اپنا کام کرتا ہوا نظر آرہا تھا جبکہ یافث ملال سے اسے تک رہا تھا۔ اسکے پیٹھ پیچھے غصے یا مقابلے بازی میں کچھ کہہ دینا الگ تھا اسکے سامنے اسکی نفرت دیکھنا مشکل۔

"میں ہم دونوں کو بہت مس کرتا ہوں۔" یکدم اسکی آواز میں ڈھیر سارے جذبات سمٹ آئے سہراب کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ "میں واپسی چاہتا ہوں اس سیاہ رات سے دن کے اجالے والی واپسی۔ تمھارے دل پر جمی برف کیا کبھی پگھل نہیں سکتی؟" ہرانا پر پیر دھرتے اس نے پہل کرنی چاہی۔

سہراب نے سرد نگاہیں اٹھا کر اسے تمسخر سے دیکھا۔ "بھرے عدالتی کمرے میں میرے کردار کو مشکوک بنانا وہ واحد جرم ہے جس کے لیے میں تمھیں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ یہ برف اب روز قیامت بھی نہیں پگھلے گی۔"

یافث طارون اسے دیکھ کر رہ گیا۔ کاش جذبات میں آکر اس نے وہ سب نہ کیا ہوتا، کاش۔

★★★★★★★★★★★★

"شام کا کوئی باسی پہر"

لان میں برقی انگیٹھی جل رہی تھی اور سیاہ چمڑے کے صوفوں پر دو عورتیں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھی تھیں۔ بیچ میں شیشے کی میز رکھی تھی جس پر کافی اور باقی لوازمات رکھے تھے۔ ایک طرف ملازم تابعداری سے کھڑا تھا۔

"تمھارے ڈاکٹر نے کیا کہا، تاج؟" تمکنت نے اپنے سامنے بیٹھی عورت سے پوچھا۔ بوڑھی عورت کے کندھے سے جھانک کر دیکھو تو اسکے سامنے بیٹھی عورت کا چہرہ بالکل اسی سے مل رہا تھا۔ وہی آنکھیں، وہی پر کشش سراپا، وہی ساحر ادا۔ اسے دیکھ کر تمکنت کی جوانی بغیر کسی وقت کے سفر کے دیکھی جا سکتی تھی۔ اور یہ سفر بلا کا خوبصورت تھا۔

"ابتسام نہیں مانتا مام۔" افسردگی سے کہتے ہوئے اس نے بھورے بال ہاتھ سے پیچھے کیے۔ "وہ کہتا ہے جب مجھے بچے کی خواہش ہے ہی نہیں تو تم خود کو کیوں تھکا رہی ہو۔ وہ یہ نہیں سمجھ رہا کہ چند سال بعد میرا کیریئر ختم

ہے۔ چالیس کے بعد اداکارہ کو کون پوچھتا ہے؟" سیاہ کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے وہ تکان زدہ لگتی تھی۔ "اب مجھے بچہ چاہیے تاکہ میں گھر پر مصروف رہوں۔ اس سب کے علاوہ بھی مجھے بچے پسند ہیں۔"

تمکنت نے ہنکارا بھرا۔ انگوٹھیوں والا ہاتھ جھلایا۔ "تم کہو تو میں بات کروں؟ یہی وقت ہے تاجور اگر تم ابھی اپنے بارے میں نہیں سوچو گی تو وقت نکل جائے گا۔"

تاج کی پر سوچ نگاہوں سے آسمان میں کچھ کھوجتی رہی۔ اداس تو وہ تھی مگر اداسی سے بڑھ کر کوئی ایک احساس تھا جو اسکے رگ وپے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ کیا وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی؟ کیا وہ ہمیشہ یونہی خالی ہاتھ رہ جائے گی؟

اسی پل اسکا موبائل بجنے لگا۔ تمکنت نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھایا تو "ویر کالنگ" لکھا آ رہا تھا۔ اسکے چہرے پر بہت کچھ آ گیا تھا۔ رنگ، چمک، شادمانی۔ اور اگلے ہی پل سب رخصت بھی ہوا۔ وہ انٹرویو والی بات نہیں بھولی تھی۔ بات نہیں شاید خود کو بے ضرر کیا جانا۔

چند پل بعد موبائل کی جگہ لیپ ٹاپ پر شاہ ویر کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کے وی نیک سوئیٹر اور ہم رنگ ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ چہرے پر مدھم مسکراہٹ تھی، جو کہ کھو کھلی لگ رہی تھی۔ تمکنت نے غور کیا تھا کہ وہ اپنے کندھے، سینے اور گردن سے بار بار کوئی نادیدہ شے جھٹک رہا ہے، صرف شاہ ویر اور تم جانتے ہو کیا؟

"میں خود بھی تمھیں بہت مِس کر رہی ہوں، ویر۔" تاج اداس سی سکرین پر نظر آتے اپنے چھوٹے بھائی سے کہہ رہی تھی۔

شاہ ویر بہ دقت مسکرایا۔ "میں اس قابل ہوں کہ مجھے یاد کیا جائے۔ کچھ الگ بتاؤ۔" بشاشیت سے کہنا چاہا مگر وہ مفقود رہی۔ پھر وہ ذرا ر کا آگے کو ہو کر اپنی بہن کو دیکھا۔ "تم نے چہرہ کیوں بگاڑ رکھا ہے؟" اپنی زندگی بگڑ رہی تھی لیکن اسے دوسروں کی تکلیف ختم کرنے کا جنون چڑھا۔

"ابتسام علاج کے لیے راضی نہیں ہو رہا۔" تاج کی جگہ تمکنت ناک سے مکھی ہٹاتے ہوئے بولی۔ "سوائے پیسے کے اس آدمی میں کچھ نہیں ہے۔ شکل بھی کچھ خاص نہیں۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے مام۔" تاج نے اسے ٹوکا۔ ان دونوں عورتوں نے شاہ ویر کی گردن کی رگوں کا تناؤ اور اسکا سخت ہوتا جبڑا نہیں دیکھا تھا۔ اسکی آنکھوں میں ابھرتی ناگواری بھی نہیں۔ "آپی تمہارا پوچھ رہا تھا۔" اسکی بہن نے بات جاری رکھی۔ اس ذکر پر نہ جانے کیوں مگر شاہ ویر کی آنکھوں میں ناگواری سی اتری تھی۔ "اسے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے لیکن تم تو جانتے ہو ناں وہ ایک بار اپنی ماں کے پاس جاتا ہے تو مہینے لگا کر لوٹتا ہے۔"

"اسکی ماں کا اپنے بیٹے پر حق ہے۔ کیوں تم ہر وقت جلتی ہو؟" شاہ ویر کی آواز پر اسکی ماں سیدھی ہو بیٹھی تھی۔ "ہر وقت تمھیں بچے کی پریشانی ہے جو وقت بچتا ہے اس میں ساس اور نندوں کا سوچتی رہتی ہو اپنے دماغ کو سکون دو۔ یہ مڈل کلاس عورتوں کی طرح اپنا خون نہ جلاؤ۔" طلال بنگش کی موت کے بعد وہ اس گھر کے حالات اور لوگوں کا سربراہ خود ہی بن گیا تھا۔

تاجور چند پل مزید اس سے بات کرتی رہی پھر وہ اٹھ گئی۔ وہ چلی گئی اور پیچھے دو لوگ رہ گئے تو انکے درمیان ایک گہری خاموشی پہرہ دار بنی۔ وہ خاموش تھا، چاہتا تھا بات وہاں سے شروع ہو، وہ پر سوچ تھیں نہیں جانتی تھیں سلسلہ کلام کہاں سے جوڑیں؟ پھر موضوع تبدیل کیا گیا۔

"تمھیں ابتسام سے کوئی مسئلہ ہے، ویر؟"

اس سوال پر شاہ ویر نے بے اختیار مٹھیاں بھینچی۔ ذہن میں کسی فلم کی طرح ایک منظر ابھرا۔

"تم نے جھوٹ کیوں بولا؟" شاہ ویر اپنی عمر سے دگنے مرد کو دیوار سے لگائے کھڑا تھا۔ اسکی آنکھوں میں سالم قہر تھا اور لہجہ چٹانوں کی سی سختی لیے ہوئے تھا۔ "تم جانتے بھی ہو تم نے ایک عورت کی زندگی برباد کر دی ہے تم اتنے گھٹیا کیسے ہو سکتے ہو؟ میں اب اس میس کو کیسے سنبھالوں گا؟"

"پلیز،شاہ ویر پلیز میری مدد کرو۔"

"مدد؟میں تم پر تھوکتا ہوں۔ملعون انسان۔"وہ غرایا۔

اسکی گریبان پر سختی سے گرفت باندھے وہ منہ سے کف نکال رہا تھا اور سامنے والا بس نگاہیں جھکائے سرخ چہرے سے سب سن رہا تھا۔جس ملاقات کی تاجور بنگش کو خواہش تھی،وہ ایک ہفتہ قبل ہو چکی تھی۔مگر خوش گوار؟ہر گز نہیں۔پر سرار یقینی طور پر۔

"میں نہیں جانتا مجھے اس سے مسئلہ ہے یا وہ خود مسئلے میں ہے۔یا پھر اسکی وجہ سے سارا بنگش خاندان مسئلے میں ہے۔"

"تم مجھ ڈرا رہے ہو،ویر۔"وہ آگے کو ہوئی،آنکھوں میں یکدم فکر امڈ آئی۔

شاہ ویر نے نگاہیں اٹھا کر سادگی سے اسے تکا۔اسکی ماں جو ایک مایا ناز اداکارہ تھی بیٹے کی آنکھوں میں ڈر کی پرچھائی تک نہ دیکھ سکی۔ہاہ۔۔۔۔۔وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔"میں واپس آکر اس بارے میں بات کروں گا۔"وہ بھی اسی کا بیٹا تھا،پوچھا نہیں جائے گا تو بتانے والے پر تُف ہو۔اگلے چند لمحے دوبارہ خاموشی۔ڈھٹائی تھی تو پھر ڈھٹائی سہی۔

"ہمارے درمیان بہت سے راز آگئے ہیں،ویر۔تم جانتے ہو ناں راز تعلق کے لئے دیمک ثابت ہوتے ہیں۔"

شاہ ویر نے ٹھنڈی گہری سانس بھری۔اسکا چہرہ یکدم سپاٹ ہو گیا تھا۔بلاخر بات شروع ہو گئی تھی۔

"آپ جانتی ہیں لفظوں میں آپ مجھ سے جیت نہیں سکتیں۔مدعے پر آئیں مام۔"

"وہ لڑکی کون ہے؟"

"میرا میلٹنگ پائنٹ۔"اس نے تین لفظوں میں بات سمیٹ کر رکھ دی۔"میں اسکے سامنے جیت چھوڑ سکتا

ہوں۔ میں اسکے لیے اپنے طرز بدل سکتا ہوں، وہ جو چاہے گی میں اسکی خوشی کے لیے ہر وہ چیز کر سکتا ہوں۔ وہ میرے لیے سانس لینے جتنی ضروری ہے۔"

تمکنت بنگش کی رنگت بدل رہی تھی۔ ہر دوسری ماں کی طرح اسے لگ رہا تھا اسکا بیٹا چھن رہا ہے۔ اسکا محبوب بیٹا اس سے باغی ہو رہا تھا۔

"تم اس سے کب ملے؟"

"نیو یارک میں، دو سال قبل۔" وہ جواب دیتا گیا۔

"اور یہ سب کب شروع ہوا؟"

"یہ سب؟ یہ سب کیا مام۔ آپ پوچھیں کہ مجھے اس سے محبت کب ہوئی۔"

تیرہ سالہ شاہ ویر کے "کرش" سے لے کر پندرہ سالہ شاہ ویر کی پہلی "دل لگی" اور بیس سالہ شاہ ویر کی "محبت" وہ ہر کسی سے واقف رہی تھی۔ اور سچ یہ تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی ٹکنے نہیں دیا گیا لیکن دو سال؟ وہ دو سال سے جسے خاندان سے چھپائے بیٹھا تھا تمکنت اس اثاثے کی موجودگی سے کس طرح لاعلم رہی؟ خنجر کب اسکی پیٹھ میں لگنا شروع ہوا اسے علم کیوں نہ ہوا؟ وہ تو بس رستا ہوا خون دیکھ رہی تھی۔

"تمھارے اور اسکے درمیان یہ تعلق کب بنا؟" اس نے سوال بدلا۔

"ڈیڑھ سال پہلے۔"

"اتنا وقت کیوں لگا؟"

"اچھی چیزیں وقت لیتی ہیں مام۔"

وہ بے حد تابعداری سے بے حد تحمل سے کہہ رہا تھا۔ہاتھ نامحسوس انداز میں گردن سے کچھ جھٹک رہے تھے۔اسکی رگوں میں خوف خون کی طرح گردش کر رہا تھا۔جسے وہ لاشعوری طور پر بھی چھپا نہیں پا رہا تھا۔

"میں بہت جلد ہی اسکے گھر والوں سے ملوں گا، آپ کو بھی ملواؤں گا۔مجھے یقین ہے وہ آپ کو بے حد پسند آئے گی۔"اس نے یقین دہانی کروائی تھی۔

"اور اگر مجھے پسند نہ آئی تو؟"

شاہ ویر چند لمحے بہت سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا پھر وہ ہلکا سا، بہت ہلکا سا مسکرایا۔تنبیہی مسکراہٹ۔یا شاید اپنے اندر کا خوف زائل کرنے کو طاری کی گئی اداکارانہ مسکراہٹ۔

"کسی انسان کی وجہ سے سانس لینا تو نہیں چھوڑا جاتا ناں ماں۔"تمکنت کے سینے میں کوئی تنگی سی ہوئی۔"وہ آپ کو اچھی نہ لگی تو کوئی بات نہیں میں آپ کا واحد بیٹا نہیں، آپ شاہ زید سے امیدیں لگا لیجئے اور یوں سمجھیئے گا کہ میں نافرمان نکلا۔"بظاہر وہ مذاق کر رہا تھا مگر اسکی ماں جانتی تھی معاملات بہت آگے نکل چکے ہیں۔

"تم اسکے لیے نافرمان بننے کو تیار ہو؟"تمکنت کی آنکھوں میں کچھ در آیا تھا۔

شاہ ویر نے کندھے اچکائے۔"یہ تو کم سے کم ہے۔"

"اور زیادہ سے زیادہ؟"

وہ ہنس پڑا۔"آزما رہی ہیں؟"

تمکنت اسکے ساتھ مسکرائیں۔"تمہاری گردن پر کچھ ہوا ہے؟"

شاہ ویر کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے اپنی گردن پر ساکت ہوا۔چہرے کی رنگت تبدیل ہوئی۔

''تم بار بار اپنی گردن اور سینے پر کچھ جھٹک رہے ہو کیا ہوا ہے؟''

کیا وہ انہیں بتا دے کہ ''وہ'' اسے تقریباً قتل کر چکا تھا، کسی نے زہریلے بچھو اسکی گاڑی میں چھوڑ دیئے، کوئی مسلسل چند ماہ سے اسے قریب دکھائی دے رہا تھا، ڈرا رہا تھا، چھوٹے چھوٹے نقصان پہنچا رہا تھا اور وہ اتنا بے بس تھا کہ اسکے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکا تھا۔

''مجھے خارش ہو رہی ہے۔شاید الرجی ہو گئی ہے۔'' بتانے کا ارادہ ترک کرتے اس نے وہ کہا جو مناسب تھا۔''زید کہاں ہے؟وہ میری کالز نہیں اٹھا رہا۔''

''آج صبح ایک کیس کے معاملے میں شیخوپورہ گیا ہے۔''

''دنیا کے سارے کام چھوڑ کر اسے کرائم اینالسٹ ہی بننا تھا؟'' شاہ ویر چڑا۔''جب کال کرو کہیں نہ کہیں گیا ہی ہوتا ہے۔''

''کہہ کون رہا ہے؟ وہ جو خود آدھا سال ملک سے باہر ہوتا ہے۔''

''خیر وہ سب چھوڑیں یہ بات یاد رکھیں کہ میں اس بار سنجیدہ ہوں۔''

موضوع جس تیزی سے بدلا گیا تھا وہ اسے واپس اسی ڈگر پر لے آیا۔ تمکنت ہولے سے مسکرائیں۔ کم پر جوش مگر حوصلہ افزاء مسکراہٹ۔ دل کی کیفیت الگ کہانی ہے۔

''میں جانتی ہوں بچے۔ اور میں بہت جلد اس سے ملنا چاہوں گی۔ تمھاری واپسی والے دن کیسا رہے گا؟''

''یہ تو وہی طے کرے گی۔'' وہ بازو پیچھے لے جاتے گردن کے کس بل نکالنے لگا۔

''تم اور کسی کے اتنے تابعدار؟''

"میلٹنگ پائنٹ سمجھا کریں۔"

★★★★★★★★★★★

"آج رات ہم یہیں رکنے والے ہیں۔"

سہراب کے اس اعلان پر وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن انارا کی بات نے اسکا ذہن جیسے مفلوج کر دیا ہو۔ وہ اسکے سامنے غصہ کر آیا تھا، لیکن اب۔۔۔۔۔۔۔اب جیسے اسے بہت کچھ برا الگ رہا تھا۔ ابھی وہ اس معاملے میں زیادہ سوچتا کہ اسکے موبائل پر کسی نئے پیغام کی نوید سنائی دی۔

اسلان اینٹی سوشل قسم کا آدمی تھا۔لوگ،دوست،رشتے دار،سوشل میڈیا وہ ان سب چیزوں سے دور تھا۔موبائل پر آنے والے ان چند پیغامات کے اوقات سے ہی وہ بتا سکتا تھا اس وقت کس نے کیا پیغام بھیجا ہو گا۔ اس وقت بھی وہ جان گیا تھا سامنے کون ہو گا۔

"کام ہوا یا ڈیمو دوں؟"

جس نمبر سے پیغام آیا تھا وہ نمبر موبائل میں محفوظ نہیں تھا وہ کتنے ہی لمحے ساکت رہا۔ ایسے جیسے بس ایک پیغام اسکا سکون اکارت کر چکا ہو۔ اسکی رنگت باقاعدہ اڑ گئی۔ کافی دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف آیا اور الماری سے ایک بستہ نکالا۔ دروازے کا لاک اچھی طرح چڑھایا۔ سفید رنگ کا چمڑے کا بستہ۔ اس نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور بستہ لا کر پلنگ پر رکھا۔ اسکے ہاتھ کپکپا رہے تھے، ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں تھیں۔ انہی لرزتی انگلیوں سے اس نے بستہ کھولا اور اگلے کئی لمحے وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ وہ ہر دفعہ یونہی کھڑا رہ جاتا تھا۔ بستے کے اندر کا سامان اسے ہر دفع یونہی ساکت کیا کرتا تھا۔

اندر جو تھا وہ بہت کچھ تھا اور شاید کچھ نہیں بھی۔ اس سے زندگی بدلی جا سکتی تھی، اسکے لیے زندگی ختم بھی کی جا سکتی تھی۔ اندر جو تھا اسلان کو اس سے نفرت تھی۔ بے تحاشا نفرت۔

"مجھے دیر سے جواب دینے والوں سے نفرت ہے، اسلان۔ کام ہوا یا نہیں؟"

موبائل کی سکرین پر ایک پیغام نظر آیا۔ اس نے بغیر جواب دیے موبائل جینز کی جیب میں ڈالا، بستے پر زپ چڑھائی اور الماری کو اپنی جگہ سے سرکایا۔ اسکی بھاری قامت اور اونچے سراپے کے آگے یہ الماری کسی کھلونے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے زور لگا کر الماری کو اسکی جگہ سے سرکایا۔ دوپٹ والی لکڑی کی الماری اپنی جگہ سے ہٹنے لگی، اسلان کے بازوؤں کی رگیں ابھر کر واضح ہو رہی تھیں۔ چہرے پر مشقت کے آثار نمایاں تھے۔ الماری ہٹی تو چپس کا سیاہ سفید فرش دکھائی دینے لگا۔ اس نے ایک محتاط نگاہ دروازے پر ڈالی پھر ہاتھ بڑھا کر فرش کے ٹائلز کو دو انگلیوں کی مدد سے سرکایا۔ وہ اس مہارت سے یہ کام کر رہا تھا کہ حد نہیں تھی۔

لعل یمن جو پہلے ایک بد قسمت گھر لگ رہا تھا اب وہ رازوں کی پٹاری نکلا۔ ٹائلز سرکانے پر فرش کے نیچے ایک گہرا گڑھا نظر آ رہا تھا جہاں کئی سفید، سیاہ اور بھورے بستے پڑے تھے۔ وقت کی ساعتیں مٹی بن کر ان پر گرتے ہوئے انکا اصل رنگ دھندلا گئی تھیں۔ اسلان نے بھاری بیگ بغیر کھولے نیچے پھینک دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

ٹائلز واپس سیدھے لگا کر، الماری کو اسکی جگہ پر رکھ کر اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے وہ کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آیا۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے نمبر پر ایک پیغام لکھا۔

"مجھ سے نہیں ہو رہا، وقت چاہیے۔" پیغام بھیج کر اس نے موبائل کے ساتھ VPN جوڑا اور گوگل پر کچھ سرچ کیا۔ کمرے میں اسکا انٹرنیٹ کام نہیں کر رہا تھا اور یہاں کسی کے آجانے کا خوف تھا۔

لال یمن اس وقت چہل پہل سے بھرا پورا تھا۔ باہر کی نسبت اندر خاصی گرماہٹ تھی۔ یہ گھر باہر سے جتنا نازک لگتا تھا اندر سے اتنا ہی مضبوط اور مختلف تھا۔ لکڑی کے پینٹ والی دیواریں خطاطی سے سجی تھیں۔ کہیں کہیں اسلان اور انارا کی بچپن کی تصاویر بھی لگی تھیں۔ جن میں وہ دونوں خوش تھے۔ انکے ماں باپ ساتھ تھے۔ اب تو خیر دونوں باتیں نہ رہی تھیں۔ لاؤنج میں صوفوں پر ڈھکے رنگ برنگے کپڑے دیواروں پر لگی مختلف ثقافتوں کی

تصاویر اور ایک دیوار تو پوری کی پوری مختلف ثقافتی رنگوں سے بھری پڑی تھی۔ کوئی سندھی ٹوپی تو کوئی رانجھے کی بانسری۔ کوئی اٹالین نوادرات تو کوئی ایرانی قالین کے ٹکڑے۔ یہ گھر دل آرا اور شجاع یمن نے کئی سال کی منصوبہ بندی کے بعد سجایا تھا۔ گھر پیچھے رہ گیا اور وہ دونوں پنچھی اونچی اونچی اڑان بھر گئے۔ گھر کے ساتھ انہوں نے بہت کچھ برباد کیا تھا، تفصیل پھر سہی۔

"تمھیں تمہاری بہن سے ملوانے لائے ہیں یہاں کونے کھدروں میں چھپنے نہیں۔" یافث کی آواز پر اسلان بری طرح چونک گیا۔ ہاتھ میں پکڑا موبائل نیچے جا گرا اور وہ سفید چہرے کے ساتھ اسے دیکھے گیا۔ یہ حرکت یافث کے لئے نئی نہیں تھی۔ اسلان کی انگزائٹی اور ڈرے ڈرے رہنے والی عادت سے اب تو سارا گھر عادی تھا۔ وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے چلتا ہوا اسکے قریب آنے لگا۔ اسلان نے جھک کر موبائل اٹھانا چاہا لیکن برق رفتاری سے یافث اسے پہلے ہی اچک چکا تھا۔ موبائل کو پلٹ کر سکرین سامنے کرتے ہوئے یافث کی آنکھیں مشکوک تھیں۔ لیکن اگلے ہی پل ان میں ملامت اتری تھی۔ اس نے تیزی سے موبائل بند کیا۔ اور بے اختیار دروازے کی طرف دیکھا کہ انارا یا سہر اب نہ آ جائیں۔

"تم ایسی غلیظ سائٹس وزٹ کرتے ہو؟" وہ بمشکل یہی کہہ سکا۔ اسلان کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمین میں گڑ جائے۔ اسکے جسم میں کپکپاہٹ شروع ہو گئی۔ رنگت تاریک پڑی۔

"، میں وزٹ نہیں . . . . میں بس . . . میں نہیں دیکھتا یہ سب، ماموں اللہ کی قسم میں نہیں دیکھتا میں۔۔۔۔" اسکے الفاظ بے ربط تھے گردن شرم سے گڑھی جا رہی تھی۔ کیا اسے یہ دن بھی دیکھنا تھا؟

"اگر تم دیکھتے بھی ہو تو کیا یہ جگہ ہے؟ باہر تمہاری بہن موجود ہے تمھیں شرم نہیں آ رہی؟"

"ماموں میں نہیں دیکھتا۔ یہ سب میرا یقین کرو، پلیز۔ اللہ کی قسم میں نہیں دیکھتا۔" وہ پچیس سالہ لڑکا نہیں دو سالہ بچے کی طرح صفائی دے رہا تھا۔ اسکی آنکھیں بھیگ رہی تھیں، وہ قابل ترس لگتا تھا۔ لیکن جو کچھ یافث نے دیکھا تھا جھٹلایا تو اسے بھی نہیں جا سکتا تھا۔

''بیٹھو..'' اب کے وہ نرمی سے بولا تو اسلان لب کاٹتے ہوئے بیٹھ گیا۔یافث اسکی دائیں طرف بیٹھا۔اسکے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ سب تمھارے اپنے لئے نقصان ہے بچے۔ میں آج تمھیں بے عزت کروں گا ڈراؤں دھمکاؤں گا لیکن اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' کل میں تمھارے ساتھ نہیں ہوں گا اور تم پھر یہی سب دیکھو گے۔ میں تمھارے ساتھ بیٹھ کر تم سے وجہ جاننا چاہتا ہوں۔ تم اپنی صحت، زندگی اور آخرت ان غلیظ ویب سائٹس پر کیوں برباد کر رہے ہو؟''

اسلان نے نگاہیں اٹھا کر شکوے سے اسے دیکھا۔''میں کہہ رہا ہوں میں نے نہیں دیکھا اور آپ میری بات نہیں مان رہے۔ آپ نے آراہ پر نظر رکھی ہے؟وہ آج کل کیا کر رہی ہے کیا آپ یہ جانتے ہیں؟''ناچاہتے ہوئے بھی وہ مقابلے بازی پر اتر آیا۔''میں۔۔۔۔۔۔''

''اپنے کارنامے اس کے سر تھوپنا بند کرو۔''یافث نے درشتی سے ڈپٹا۔''آراہ تمہاری طرح ہر دفع مجھے مایوس نہیں کرتی۔''

''یہ کہیں کہ آپ مایوس ہوتے نہیں،ورنہ آراہ وہی لڑکی ہے جو کسی لڑکے سے رابطے میں ہے۔یہ تربیت کی آپ نے اس کی؟''

اسکی آنکھوں کی سرخی،اسکی گردن کی ابھرتی رگیں اور نگاہوں کا سوال۔یافث کو رخ پھیرنا پڑا۔

''مجھے یقین ہے وہ ہمیں مایوس نہیں کرے گی۔''

''اور میں؟آپ کو مجھ پر یقین کیوں نہیں ہے۔''

یافث نے سخت سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔''تم یقین کا موقع کب دیتے ہو؟useless''اس نے اضافہ کیا۔

اسلان کے حلق میں آنسوؤں کا کوئی گولہ سا اٹک گیا۔ چند سال پہلے وہ بھی کسی کو ملوانے لایا تھا۔ وہ بھی اسی طرح کے لفظ سننا چاہتا تھا جو آراہ کے بارے میں کہے گئے مگر اس سے نہیں کہے گئے اس گھر میں کسی سے نہیں کہے گئے۔ جب کسی کو اسکی پرواہ ہی نہیں تو وہ کیوں کرے؟

★★★★★★★★★★★

وہ رات یمن اور طارون خاندان نے ایک چھت کے نیچے گزاری تھی۔ انارا اور اسلان کی دوبارہ کوئی ملاقات نہیں ہو سکی کہ وہ کھانا کھائے بغیر سونے چلا گیا تھا۔ سہراب نے کھانا ختم کر کے اس سے بس یہ کہا۔۔۔

"صبح پانچ بجے تم اور میں جاگنگ کے لیے جائیں گے تیار رہنا۔"

وہ اگر اُلو کی پٹھی ہوتی تو یقیناً "جاگنگ" کے لیے تیار رہتی لیکن گھر سے باتیں چھپانے والی لڑکی کی حسیات اور عقل تیزی سے کام کرتی ہے وہ جانتی تھی یہ بات اب اسکے دو سالہ تعلق شاہویر بنگش کے متعلق ہونی تھی۔ اور سہراب سے یہ بات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

"چاچو مجھ سے تمھارے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں میں کیا بتاؤں؟"

"شاہویر میرے میسجز دیکھو۔"

"شاہی کہاں ہو؟"

"تم اب مجھے پریشان کر رہے ہو۔"

"مجھے پتا تھا تم ایک دن مجھے دھوکہ دے جاؤ گے۔"

سہراب کے جانے کے بعد اس نے لگاتار پیغامات بھیجے تھے لیکن جواب ندارد۔ اسے فطری پریشانی لاحق ہوئی۔ شادی کا ذکر ہر لڑکی کے لیے سب سے پہلے پریشانی کا سبب بنتی ہے انارا طارون کے لیے بھی یہ ذکر پریشانی

ہی لایا۔ مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق وہ ساری رات کی جاگی۔ شاہ ویر کو ڈی ایم بھیجا، میسج کیے، کال کیں یہاں تک کہ ای میل بھی لکھ دی لیکن جواب نہ آنا تھا نہ آسکا۔ بلاخر اس پر دھوکے باز ہونے کی مہر لگا دی۔

صبح ساڑھے چار بجے لعل یمن کے لان میں موجود تھی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا ہوا سہراب اسے دیکھ کر ٹھٹھکا۔

سرمئی رنگ کے ٹراؤزر اور اوور سائز شرٹ کے اوپر سفید رنگ کی مردانہ ہڈی پہنے وہ کوئی نمونہ ہی لگ رہی تھی۔ سیاہ لمبے بالوں کا جوڑا بنا تھا اور چہرے کی بشاشیت غائب تھی۔ اگر کچھ تھا تو بس تفکر۔

"تمہارے پانچ پہلے ہی نہیں بج گئے؟" سیاہ ٹراؤزر اور سویٹر میں ملبوس آدمی آگے آیا اور آراہ کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔ "یہ تھیلا کس کا ہے؟" اسکا اشارہ ہوڈی کی طرف تھا۔

"عالمگیر یمن کا۔"

"اوہ۔۔۔۔۔۔۔" سہراب نے ستائشی انداز میں بھنویں اٹھائیں۔ "suits you"

"چرا کر گھر لے جاؤں؟" وہ یکدم ساری فکریں بھول گئی۔ اپنے چچا، بھائی اور ماموں کے کپڑوں پر ہر ڈاکہ اسی کا پڑتا تھا۔

"پولیس کے سامنے چوری کی بات؟"

"اونہوں، چچا سے اجازت نامہ۔"

سہراب نے سر نفی میں ہلایا پھر محبت سے اسے اپنے بازو کے حلقے میں لیے آگے بڑھ گیا۔ دروازہ کھولا، پھر تالا چڑھایا اور تھوڑی دیر بعد وہ دونوں دھند آلود پارک کے ٹریکنگ ایریا پر بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔

"تم نے کب سے جاگنگ نہیں کی؟" دو منٹ کے اندر اندر وہ بری طرح ہانپنے لگی تو سہراب نے سنجیدگی سے

پوچھا۔ وہ دومنٹ بھی بھاگ نہیں سکی۔ آہ۔

”بس۔۔۔۔۔۔۔ کوئی۔۔۔۔۔ دو۔۔۔ تین ماہ ہوئے ہیں۔“

”یعنی چھ سات ماہ؟“ نا محسوس انداز میں وہ اپنی رفتار سست کر چکا تھا۔ ”وزن کیا ہے تمہارا؟“

”ساٹھ کلو۔“ اس نے پھولے تنفس سے بامشکل جواب دیا۔

”یعنی پینسٹھ کلو۔“

آراہ اپنی جگہ ٹھہر گئی تو سہراب کو بھی ٹھہرنا پڑا۔ وہ شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آپ اس سردی میں مجھ سے میرا وزن اور ورزش کا اسٹیمنا پوچھنے آئے ہیں تو یقین کریں یہ انتہائی احمقانہ حرکت ہے۔“

سہراب اور اسکے درمیان ہلکی سی دھند تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

”تم مجھے احمق کہہ رہی ہو؟“

”یار چاچو کیا ہے یار۔“ وہ روہانسی ہوئی۔ سہراب دھند کا سفر پار کر کے آیا اور اسکا ہاتھ پکڑا، سنجیدہ نگاہوں سے چند پل اسے دیکھتا رہا پھر یونہی اسکا ہاتھ پکڑے سست رفتار سے دوڑنے لگا۔ یعنی دوڑنا بند نہیں ہو گا۔

”بھائی کیسا ہے چاچو؟“ پھولی سانسوں کے درمیان پوچھا۔

”میرا یا تمہارا بھائی؟“

”آپ کے بھائی کے چھوٹنے میں فلحال وقت باقی ہے میں اپنے والے کا پوچھ رہی ہوں۔“

"ہیں تو دونوں پرلے درجے کے خبیث لیکن اب ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو سنو۔۔۔۔۔۔" وہ دوڑنا چھوڑ بس چلنے لگا تھا۔"انتہائی اکھڑ، بد تمیز، گھٹیا اور بے غیرت ہے تمہارا بھائی۔ یونیورسٹی سے ایکسپیل ہونے والا تھا میں نے بچایا ہے۔ اب بس میرا تبادلہ ہو جائے لاہور، یا تو کہیں پرائیویٹ نوکری پر لگوادوں گا یا پھر دوبارہ یونیورسٹی۔"

دھند میں یکدم بھاری بوجھل پن بھی شامل ہو گیا۔ ہوائیں اسی بوجھ سے وزنی ہونے لگیں۔

"پرائیویٹ نوکری؟ چاچو وہ شہر کے ٹاپرز میں شمار ہوتا رہا ہے وہ اس سب کا حقدار نہیں ہے۔"

"پڑھائی تیاگ کر محبوبہ کا غم سینے سے لگا کر وہ بیٹھا ہے میں نہیں۔" سہر اب غصے میں نہیں تھا وہ بس کہہ رہا تھا۔"تمھارے باپ کو بیٹے کی خبر لینے کی فرصت نہیں ہے اور سچ کہوں تو اسلان اب وہ بچا نہیں ہے جسے میں ڈپٹ کر چپ کروادوں۔" وہ متانت سے کہہ رہا تھا۔ سختی اور کرختگی آراہ کے سامنے مفقود تھی۔"خیر۔۔۔۔۔۔۔" اسکی اترتی رنگت دیکھ اس نے بات بدلی۔"میرا ایک دوست ہے اسکے چھوٹے بھائی کا رشتہ آیا ہے تمہارے لیے۔"

ہواؤں میں بوجھل پن کے ساتھ ساتھ ڈھیر سارا ان دیکھا خوف بھی بھر گیا۔ آراہ کے گلے میں ایک گلٹی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ اس نے بے اختیار یہاں سے وہاں دیکھنا شروع کر دیا۔ دل ہی دل میں شاہ ویر کو ڈیڑھ ہزار القابات سے نوازا اسکے واپس پیغام نہ بھیجنے پر دینے والے طعنے بھی سوچ لیے۔

"میں چاہتا ہوں تم ایک بار لڑکا دیکھ لو پھر ہم بات آگے بڑھاتے ہیں۔"

"لڑکے والی لڑکی کو دیکھنے آتے ہیں چاچو۔"

"ابھی کسی لڑکے کی اتنی اوقات نہیں ہوئی کہ میں تمھیں انکے سامنے لاؤں۔"

آراہ نے ہونٹ کاٹتے ہوئے اسے دیکھا۔ ورزش، وزن، ہوڈی، اسلان، عالمگیر سب ایک طرف ہو گئے جو بات وہ کرنا چاہ رہی تھی وہ مشکل تھی، بہت مشکل۔

"کچھ کہنا ہے؟" سہر اب اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ "بلکہ مجھے لگتا ہے اب تمھیں کہہ دینا چاہیے۔ میں جاننا چاہتا ہوں تم ہم سب کے درمیان بیٹھے ہوئے کس کو میسجز کرتی ہو۔"

آراہ کا دل سکڑ کر پھیلا۔ چچا سے لاکھ دوستی سہی لیکن وہ اپنے منہ سے کیسے یہ بات کرے؟ شاہ ویر اسے بتا سکتا تھا بات کیسے شروع کی جائے لیکن اسے تو میسج کا جواب دینے کی فرصت نہیں۔ آہ شاہ ویر آہ۔

"ایسا کچھ نہیں ہے چاچو۔۔۔۔۔۔"

"تم اگر مجھے خود بتا دو تو بہتر ہے ورنہ تفصیل نکلوانا میں جانتا ہوں۔" وہ ٹریک سے ہٹ کر ایک طرف بچھی گھاس پر آ کر بیٹھ گیا۔ اسکا لہجہ نہ نرم تھا نہ زیادہ سخت۔ وہ بس ایک مڈل کلاس مرد کا لہجہ تھا جسے اپنی چار دیواری کے گرد ایک بھنک پڑی تھی اور اب وہ بال کی کھال اتارے بغیر چپ نہیں رہ سکتا تھا۔

"آپ مجھ پر غصہ ہوں گے؟" وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھی۔

"کیا کوئی ایسی بات ہے جس پر مجھے غصہ ہونا چاہیے؟" اسکی بھوری آنکھیں بیک وقت سنجیدہ اور نرم تھیں۔ "میں تمھارے ہر درست فیصلے میں تمھارے ساتھ ہوں، آراہ۔"

انارا نے سر جھکا لیا۔ وہ یہاں وہاں کی ہانک سکتی تھی۔ ڈھیروں ڈھیر بکواس کر سکتی تھی لیکن سامنے والے کو یہ بتانا کہ اس نے کوئی درست فیصلہ کیا ہے یہ ایک مشکل کام تھا اور وہ مشکل سے بھی نہیں کر پاتی تھی۔ کیا تھا اگر وہ خود پر بھروسہ کرنا سیکھ لے۔

"میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "وہ بہت اچھا ہے چاچو وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے اور مجھ سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا ہے۔۔۔۔۔۔"

"کیا کرتا ہے؟" کوئی کھنچاؤ تھا جو اسے اپنی ہڈیوں میں اترتا محسوس ہوا۔

"لکھاری ہے۔"

"کھلانے پلانے کی اوقات والا لکھاری یا جس کے مسودے مسترد ہو کر آتے ہیں ویسا؟"

"اسکی کتابیں نیویارک ٹائمز کی بیسٹ سیلرز ہیں۔اور اس کا سکرین پلے؟ آپ جانتے ہیں انگریز اسکے لکھے ہوئے کے دیوانے ہیں۔"

"اوہ پھر کنورٹ کون ہو رہا ہے وہ یا تم؟"

"چاچو وہ مسلمان ہے۔" آراہ نے اپنی بات پر زور دیا۔

"اندھا، کانا، لنگڑا، گونگا؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے یار ایسا کچھ نہیں ہے بلکہ اچھا خاصا خوبصورت ہے۔"

سہراب نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے دیکھا۔"تم نے دن میں خواب دیکھنا کب شروع کیے بچا؟اب تم کہو گی وہ پاکستانی بھی ہے اور اسکا نام شاہ ویر بنگش بھی ہے اور۔۔۔۔۔۔۔" وہ بولتے بولتے رکا۔آراہ کی نگاہوں میں شاہ ویر بنگش کے نام پر کچھ آیا تھا۔سہراب کئی لمحے سانس نہیں لے سکا۔اس نے یہ نام یونہی لے لیا تھا کیونکہ کل اسکی اسلان سے اسی آدمی کے متعلق بات ہوئی تھی مگر۔۔۔۔۔

"اسکا نام شاہ ویر بنگش ہی ہے۔" وہ محبت میں سرشار محبوب کے الفاظ تھے۔سہراب یمن کے چہرے سے کچھ واضح نہیں ہوتا تھا لیکن اسکا دل باقاعدہ اپنی جگہ سے پھسل کر ایک طرف ہوا تھا۔بنگش خاندان لاہور کے بڑے بڑے گھرانوں میں شمار ہوتا تھا اور یمن خاندان؟لاہور کے نقشے پر انکا چھوٹا سا گھر دکھائی دے جائے یہ بھی غنیمت تھا۔اس خاندان سے کدورت کئی برس پرانی اور راسخ تھی۔یہاں تعلق نہیں جڑ سکتا تھا کیونکہ ان سے تو جنگ تھی۔

"وہ تم سے کہاں ملا تھا؟"

اس سارے میں آراہ پہلی بار مسکرائی۔ یہ سوال اسے دو سال پیچھے لے گیا تھا۔ دو سال قبل جب اسے زندگی میں "زندگی" ملی تھی۔

★★★★★★★★★★★★★

"کیا ہم دو سال پیچھے سفر کریں گے؟" لکڑی کے فرش پر بیٹھی لڑکی جوش سے پوچھ رہی تھی۔ اسکے گال دہک رہے تھے۔

"ہاں، کیونکہ اسکی ضرورت ہے۔ تمھیں نہیں لگتا کہانی میں کچھ مسنگ ہے؟" مرد نے سوال کیا۔ کافی پیتی لڑکی نے ایک گھونٹ بھرا اور چند لمحے پر سوچ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بہت ٹھہر کر، تول تول کر جواب دیا۔

"رومانس، اس کہانی میں رومانس کی کمی ہے۔"

"اب نہیں ہو گی۔" یقین دہانی۔

★★★★★★★★★★

"دو سال قبل۔"

"نیویارک، ٹائم اسکوائر۔"

"کڑی نوں کلا لہور توں امریکا پیج دتا، دسو بھلا کوئی تک بنڑدی اے؟"

(لڑکی کو اکیلے لاہور سے امریکا بھیج دیا، لو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟)

انارا طارون کے امریکا اپنے باپ اور اسکی دوسری بیوی اور بچوں کے پاس جانے کی خبر محلے والوں پر تو بجلی بن کر ہی گری تھی۔ کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لاکھوں روپے کا خرچہ کر کے لاہور سے امریکا جانا کوئی چونچلا نہیں، ایک بیٹی کا اپنے باپ سے ملنا تھا۔ لوگوں کی باتوں پر کان بند کر کے وہ زندگی میں پہلی بار نیو یارک قدم رکھ چکی تھی۔ لیکن جس طرح نئی ڈائن دل نکالنے کے فعل سے نابلد ہوتی ہے اسی طرح انارا طارون اپنے باپ کی "حرکتیں" سمجھنے سے نابلد تھی۔ بیٹی کو اپنے پاس بلوا کر وہ سارا سارا وقت باہر رہتا اور بیچاری بیٹی باپ کے آدھے انگریز، آدھے پاکستانی بچے دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھتی رہتی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اسے سمجھ آگئی تھی کہ نیو یارک آنا اسکی زندگی کی سب سے بڑی غلطیوں میں سے ایک تھی۔ لیکن پیسہ تو لگ چکا تھا اب گوروں کے چونچلے دیکھنے اور انسٹا گرام کے لیے چند تصاویر لینے سے کیوں باز رہا جائے؟

ناک میں بالی جیسی نتھ پہنے ہوئے سفید شرٹ کے ساتھ ہلکا آسمانی اوور کوٹ پہنے وہ اس روز نیو یارک کی سڑکوں پر بلا ارادہ چہل قدمی کرنے نکل آئی۔ رات کے وقت نیو یارک کی مشینی زندگی "پر لطف" زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دفتر اور مکتب سے لوٹے جوڑے کیفے یا کلبز کا رخ کرتے نظر آتے ہیں، بار میں رش بڑھ جاتا اور نیو یارک کی ایلیٹ کلاس اس سمے پیسے کا بے دریغ استعمال کرتی نظر آتی ہے۔

ٹائم اسکوائر کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس کے چہرے پر چھائی سوگواری بڑھ گئی۔ ذہن میں مختلف مناظر ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

("وہ تمہاری بیٹی ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں مجھے مجبور مت کرو کہ میں اسے یہاں سے روانہ کر دوں۔" اسکی سوتیلی ماں انگریزی میں چیخ چلا رہی تھی۔ اسکا باپ کھسیانے بلے کی طرح گردن جھکائے کھڑا تھا۔

"میں تم سے یہ نہیں کہہ رہا کہ اس کا خیال رکھو، اسکے کھانے پینے کا دھیان رکھو میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تم ہمارے باقی بچوں کی طرح تھوڑی بہت توجہ اس پر بھی دے دو۔"

"کیا میں تمہارے باپ کی نوکر ہوں؟"

عورت مزید بدتمیزی سے چیخی۔ شجاع یمن جواباً ضرور چیختا، اس کا منہ بند کرواتا لیکن مرد کی خالی جیب اسکا گلا بٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ اس معاشرے میں اپنی امیر بیوی کے پیسے اور نام سے جانا جاتا تھا۔ چند دن کے لیے باپ سے ملنے آئی بیٹی کے لیے وہ دربدر نہیں ہو سکتا تھا سو چپ ہو رہا۔)

ٹائم اسکوائر لمبی تاحد نگاہ پھیلی ہوئی گلیوں پر مشتمل ہے۔ جہاں سڑک کے دونوں اطراف اونچی عمارتیں کھڑی ہیں جن پر ہمہ وقت کسی فیشن شو، فلم، تھیٹر، موسیقی، اداکاروں یا آرٹس کے متعلق اشتہار چلتے رہتے ہیں۔

یہ جگہ نیویارک کے ڈاؤن ٹاؤن کی حیثیت رکھتی ہے۔ انارا مختلف دکانیں، انکے باہر سجی کرسیاں دیکھتی چلتی جا رہی تھی۔ کرسمس کے دن نزدیک تھے ہر دکان کے باہر کرسمس کا درخت لگا تھا۔ کہیں کرسمس پریڈ ہو رہی تھی۔ غرض کہ ہر طرف رونق تھی، لوگ تھے، خوشیاں اور طمانیت تھی۔ مگر کوئی وجود تھا جس کے چہرے پہ محض اداسی تھی۔ اس زندگی کا کیا مقصد تھا جس میں خاندان ہی آدھا ادھورا ملا۔ اسکا ذہن مختلف سوچوں کی آمجگاہ بنا ہوا تھا۔

بہت کم عمری سے اس نے ماں باپ کے درمیان جھگڑا دیکھا، پھر جھگڑا طول پکڑتا گیا اور بات طلاق تک آگئی۔ ماں باپ لڑیں جھگڑیں اس بات کو بچے کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیتے ہیں۔ ماں باپ الگ ہو جائیں، یہ بات کوئی کوئی ہی برداشت کر سکتا ہے۔ انارا طارون آج تک عدالت کے وہ چکر، نان ونطفہ کے فساد اور ہر روز کے مسائل نہیں بھولی تھی۔

نیویارک ٹائم اسکوائر ہوتا ہوگا لوگوں کی جنت مگر اسکے لیے یہ جگہ اور لوگوں کی خوشی دم گھونٹنے جیسی تھی۔ اسے لوگوں کی خوشیوں سے نفرت ہو رہی تھی۔ کیا وہ لوگوں سے جل رہی تھی؟

("ڈیڈ۔۔۔۔۔" اسے نیویارک آئے دو سے زائد ہفتے ہو گئے تھے جب اسے پہلی بار اپنے باپ سے اکیلے میں بات

کرنے کا موقع ملا تھا۔"ڈاکٹر سے کب کا اپائنٹمنٹ لیا ہے؟"

لان میں رکھی سفید رنگ کی کرسیوں میں سے ایک پر وہ اپنے باپ کے سامنے آکر بیٹھی۔ شجاع ہلکا سا مسکرایا اور اسکی کرسی اپنے قریب کھینچی۔

"بس کچھ دن رک جاؤ مجھے ایک کام سے واشنگٹن جانا ہے وہ کر کے آجاؤں پھر چلتے ہیں۔"

نیویارک آنے کی پہلی وجہ آراہ کا طبی معائنہ تھا۔ اسکا دایاں بازو پیدائشی طور پر کہنی کی جگہ سے جامد تھا۔ ایسے کہ وہ اسے اونچا نہیں کر سکتی تھی۔ پاکستان میں علاج کے لیے مارے مارے پھرنے کے باوجود بازو کسی طور ٹھیک نہ ہو سکا تو شجاع نے اسے اپنے پاس بلوالیا۔ یہاں اسکے جاننے والوں نے ایک دو ڈاکٹر کا پتا بتایا تھا اور وہ پر یقین تھا کہ آراہ کا علاج بہت اچھی طرح ہو جائے گا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟" وہ امید سے پوچھ رہی تھی۔ جواباً شجاع کی مسکراہٹ دھیمی پڑ گئی تھی۔ یہ صاف انکار تھا، یعنی وہ اسے اپنی انگریز بیوی اور چار عدد آدھے انگریز آدھے دیسی بچوں کے پاس چھوڑ کر واشنگٹن جانے والے تھے۔ جانے کیوں مگر آراہ کے دل میں باپ کی طرف سے لگی گرہیں مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔)

وہ چلتے چلتے ایک جگہ آکر رکی تھی۔ ایک اونچی عمارت کے اوپر لگی سکرین پر کسی کریم کا اشتہار چل رہا تھا۔ گلابی اور سنہری روشنی اسکے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ناک کی بالی دمک رہی تھی۔ سانولے بھرے بھرے چہرے پر روشنی پڑتی تو وہ چمکنے لگتا۔ آنکھوں کی افسردگی مگر الگ قصہ تھا۔

وہ ٹائم اسکوائر کی سرخ سیڑھیوں کے قریب رکی تھی آس پاس ہنستے مسکراتے گاتے جھومتے لوگ تھے۔ اسی پہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو گئی۔ سرما کی پہلی برف باری۔ ٹائم اسکوائر کے لوگوں کو گویا جنت کے اندر دوسری جنت مل گئی ہو۔ تصاویر بناتے لوگ اب دھڑا دھڑ تصاویر اتار رہے تھے۔ آسمانی لباس والی لڑکی سفید برف باری اور روشنیوں میں گھری آس پاس دیکھ رہی تھی۔ یکدم سب بدل گیا تھا۔

نئی دنیا، نئے لوگ، خوشی، قہقہے، محبت روشنیاں، برف باری، آسمانی اوور کوٹ والی لڑکی نے چہرہ آسمان کی جانب اٹھالیا تھا۔ برف کے ذرے اسکے چہرے پر گرتے تھے۔ اور وہ بچوں کی طرح کھلکھلا دیتی۔ بے ہنگم شور، لاتعداد لوگ، کئی ملک کئی مختلف تہذیبوں سے آئے لوگ، بے انتہا روشنیاں، اور ان سب کے درمیان وہ بھی تھا، وہ جس کے گلے میں سفید سونے کی زنجیر تھی۔ ڈھیلے پینٹ کے اوپر لمبا سفید برف جیسا سفید اوور کوٹ پہنے وہ اپنے سے ذرا فاصلے پر کھڑی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس سردی میں بھی اسکے سفید ہاتھوں کی لمبی خوبصورت انگلیاں دستانوں سے پاک تھیں۔

وہ اسے چھ ماہ بعد دیکھ رہا تھا لیکن آج بھی وہ پہلی ملاقات اسکے ذہن پر کسی سنہری یاد کی طرح درج تھی۔ کچھ تھا اس میں، یا اس ملاقات میں کہ وہ اسے بھول نہیں پایا تھا۔ ٹائم اسکوائر کی برف باری غائب ہوئی، عمارتیں سمندر برد ہوئیں، رونقیں رہزن لے اڑے۔ وقت کے دھارے میں تیز بہاؤ کے چپوؤں پر سفر کرتے ہوئے وہ چھ ماہ قبل کی ایک ملاقات میں فلم کے کسی کردار کی طرح ٹھہر گیا۔ چھ ماہ قبل، جب وہ اس سے پہلی بار ملا تھا۔

(کوہ مری میں سیاحوں کے آنے کا موسم آگیا تھا۔ ہر کیفے، ہوٹل اور ریستوران کے باہر مقامی لوگوں سے زیادہ سیاحوں کا رش تھا۔ رونقیں عروج پر تھیں، برف باری نے الگ ہی سماں باندھ رکھا تھا۔ یہی برف باری کئی جگہ بتیوں کے گل ہونے کا سبب بھی تھی۔ وادی کی رونقیں بڑھ گئی تھیں۔

”کیا چاہیے تمھیں۔ دیکھو جتنا کیش تھا میں سب دے چکا ہوں اب کیا؟“

نیم تاریک گلی سے آتی اس آواز پر لڑکیوں کے ایک غول کے ساتھ جاتی لڑکی ٹھہر گئی تھی۔ اسکے ہاتھ میں ایک بڑا سا اسپیکر تھا غالباً وہ اسکے زریعے غول سے جدا ہوئی لڑکیوں کو بلانے والی تھی۔

”بدتمیزی کیوں کر رہے ہو؟ تمھیں جو چاہیے وہ میں دے رہا ہوں ناں؟“ آواز کے ساتھ ایک بھاری تھپڑ کی آواز بھی آئی، وہ جو آگے بڑھنے ہی لگی تھی بالکل دیوار کے ساتھ لگ گئی اور گلی کی طرف آدھا چہرہ نکال کر دیکھا، اسکے کھلے ہوئے بال دائیں کندھے سے نیچے لٹکنے لگے۔

”زیادہ ہوشیاری مت دکھا،جو جو ہے سب نکال۔“چاقو کی نوکیلی دھار ایک لڑکے کے اوپر تانے دوسرا لڑکا بدمعاشی سے کہہ رہا تھا۔

”یہ بھی نکال چل جلدی کر۔۔۔۔“اسکی بائیں طرف کھڑے ہوئے لڑکے نے گلے کی چین کی طرف اشارہ کیا جس پر کتھئی آنکھوں والے نوجوان نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں یہ نہیں دے سکتا۔“وہ پیچھے ہوا۔”تم کیش لے لو میرا موبائل لے لو لیکن یہ نہیں۔۔۔۔“قطعیت اور سختی سے کہہ کر وہ پیچھے ہوا جب لڑکوں میں سے ایک نے اسکے منہ پر گھونسا دے مارا۔وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوا اور یہی وہ وقت تھا جب دیوار کی اوٹ میں کھڑی لڑکی نے جھک کر برف کی چادر سے ڈھکے ایک پتھر کو اٹھایا اور وہیں جھک کر بدمعاشوں میں سے کسی ایک کے گھٹنے کا نشانہ لیا۔ہیزل آنکھیں ہلکی سی چھوٹی کیں اور پوری قوت سے وہ پتھر اسکے گھٹنے پر دے مارا۔سردیوں کی چوٹ تھی گھٹنے سے دل تک سرایت کر گئی۔لڑکا گھٹنوں کے بل گر پڑا۔شاہ ویر کی نگاہ اس طرف پڑی تو وہ جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہو گئی۔

”اے یہ پتھر کس نے مارا؟“

لڑکی نے تین چار پتھر اٹھائے اور پے درپے انکے گھٹنوں اور سینے کے نشانے لیتی گئی۔گلی کے عین بیچوں بیچ کھڑا اوورکوٹ اور سفید زنجیر والا لڑکا حیران تھا۔اگر یہ پتھروں کی کوئی بارش تھی تو وہ محفوظ کیونکر تھا؟

اسی لمحے لڑکی دیوار کی اوٹ سے نکل آئی اپنے لمبے اوور کوٹ کی آستین چڑھائیں،کمر کے گرد بیلٹ کو سختی سے کسا اور ایک پتھر اٹھا کر ہراساں کرنے والوں میں سے کسی ایک کو دے مارا۔اسی لمحے،عین اسی پل برف کے درمیان گرے پڑے شخص نے کراہتے ہوئے نگاہیں اٹھائیں اور اپنے سامنے آسمانی اوور کوٹ والی لڑکی کو دیکھا۔سفید برف ذرات کی صورت اسکے کھلے ہوئے لمبے بالوں میں کسی جگنو کی طرح جگہ بنا رہی تھی۔دور کہیں سے آتی سٹریٹ پولز کی روشنی اسکی پشت پر پڑ رہی تھی۔اسکا چہرہ واضح نہیں تھا۔وہ سرعت سے دوبارہ دیوار کی اوٹ میں ہو گئی۔موبائل پر تیزی سے یوٹیوب کھول کر پولیس کی گاڑی کے سائرن لکھ کر سرچ کیا۔

"دیوار کے پیچھے دیکھ کون ہے ادھر۔" باس کے حکم پر دوسرا لڑکا اس طرف بڑھا اسی لمحے انارا نے چلتا ہوا سائرن مائیک کے قریب کیا، یوں کہ اب سارے میں پولیس کی گاڑی کے سائرن بجنے لگے۔

لڑکوں نے جلدی سے موبائل اور پرس اٹھایا اور بھاگ گئے۔ انارا کافی دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ شاہ ویر وہیں زمین پر گرا ہوا تھا۔ بہت دیر بعد اس نے دیوار کی اوٹ سے جھانکا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اور شیر ہو گئی۔ لائٹ آگئی تھی اور اب آس پاس کئی لوگ بھی گزر رہے تھے۔ تب ہی وہ گلی کے اندر کی طرف بڑھی۔ شاہ ویر کے سامنے آکر رکی۔ ہاتھ اسکی طرف بڑھایا، وہ ہلکا سا زور دیتے ہوئے اٹھا۔ گرنے کی وجہ سے اسکی کمر پر شدید چوٹ لگی تھی۔

"کچھ کھایا پیا کرو۔"

تہہ دل سے سامنے والے کو مشورہ دیا اور پھر وہ گلی سے باہر نکل گئی۔ شاہ ویر چند لمحے وہیں کھڑا رہا جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوئی تو اس نے جھک کر بٹوے سے نکلے کارڈز اٹھائے اور آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے اسے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ اس نے آس پاس دیکھا اور پھر گلی کے موڑ کی طرف بڑھا۔

اسے زیادہ دور نہیں جانا پڑا وہ گلی سے نکلتے ہی کسی چیز پر پھسل کر نیچے گر گئی تھی اور اسکا پیر بجری اور سیمنٹ میں اٹک گیا تھا۔ یہاں روشنی تھی شاہ ویر اسکا چہرہ بھی دیکھ سکتا تھا۔ ناک کی بالی بھی، اسکا آسمانی اوور کوٹ بھی اور اسکی ہیزل آنکھیں بھی۔ وہ سب دیکھ رہا تھا سوائے اس ان دیکھی گرفت کے جو اس کے گرد بندھ گئی تھی۔

اپنے بھرے بھرے سراپے کی وجہ سے وہ اٹھنے کی کوشش کرتی اور پھر رپٹ کر گرتی۔ ہلکی سی روشنی میں شاہ ویر نے دیکھا کہ وہاں کچھ چکنا مائع گرا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اسکے ہاتھ زمین پر ٹک نہیں رہے تھے اور وہ پھسل رہی تھی اس پر تضاد کہ اسکا پیر پھنسا ہوا تھا۔ شاہ ویر نے جھک کر اسکے قریب بیٹھتے ہوئے پہلے اسکا بوٹ والا پیر آزاد کروایا پھر اپنا ہاتھ اسکی طرح بڑھایا۔

انگلیاں کسی ماہر مصور کی انگلیوں کے جیسی تھیں۔ ناخن تراشے ہوئے، ہاتھ پر بال نہ ہونے کے برابر۔ آراہ نے اپنا

ہاتھ اسکی طرف بڑھایا، چکنے ہاتھ نے اس کا سارا ہاتھ چکنا کر دیا۔ شاہ ویر نے جھک کر مضبوطی سے اسکے دونوں ہاتھ تھامے اور پھر کھینچ کر اسے کھڑا کیا تو وہ کھڑی ہو گئی البتہ اسکا چہرہ بتا رہا تھا چوٹ زبردست تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

"کچھ کم کھایا کرو۔"

سیاہ رات میں سفید اور آسمانی رنگ گھلنے لگا۔ ماسک کے باعث آراہ اسکا پورا چہرہ نہیں دیکھ سکی لیکن اسکی کتھئی آنکھیں مسکراتی ہوئی لگیں۔

"تم باڈی شیمنگ کر رہے ہو؟" آس پاس گزرتے لوگوں سے بے نیاز وہ تیز لہجے میں بولی۔

"شروع کس نے کی تھی؟"

"میں نے تمھیں بچایا ہے۔"

"ابھی دو منٹ پہلے سرکس کا کرتب میں نے بھی نہیں دکھایا۔"

"تم۔۔۔۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا کہ عقب سے آتی آواز پر ٹھہر گئی۔ "تم تو ایک ناشکرے انسان نکلے۔"

"اور تم بے عمل۔ جو بس دوسروں کو مشورے دیتی ہے اپنی باری پر عمل نہیں کرتی۔"

"انارا۔۔۔۔۔؟ تم یہاں ہو ہم پریشان ہو گئے تھے سر بھی تمھیں ڈھونڈ رہے تھے۔" وہ کالج کے جس سیاحتی غول کے ساتھ آئی تھی اسکی چند لڑکیاں تشویش سے آگے آئیں۔

"اوہ.. ہاں میں راستہ بھٹک گئی تھی۔" اس نے شاہ ویر کو دیکھتے ہوئے چبا چبا کر کہا اور پھر مڑ گئی۔ شاہ ویر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسکے کوٹ کی پشت پر، ہاتھوں اور دامن پر گریس کے دھبے لگ گئے تھے لیکن وہ اس سب سے بے نیاز اپنی ساتھیوں کے ساتھ اسکی شان میں کچھ کہتی ہوئی واپس جا رہی تھی۔ اسکے لیے ماسک والا یہ لڑکا مسیحائی کا

ایک قصہ تھا لیکن شاہ ویر بنگش کے لیے وہ یادگار کہانی بن کر جا رہی تھی۔اسے اس وقت علم نہیں تھا کہ انارا طارون کو وہ بھول نہیں سکے گا۔مری کا یہ واقعہ اسکی داستان حیات پر نقش ہو جائے گا۔

حال میں ٹائم اسکوائر کی رونق،لوگوں کا رش، بھانت بھانت کی بولیاں،وہ سب کو نظر انداز کرتا اس لڑکی کی جانب بڑھ رہا تھاوہ جو اب تک گردن پیچھے پھینکے اپنے چہرے پر گرتی برف سے محظوظ ہو رہی تھی۔لڑکے کے قدم اسکی جانب اٹھ رہے تھے کوئی کشش سی تھی جو اسے کھینچ رہی تھی اور وہ کھنچتا چلا آیا تھا۔اسکے قریب دائیں طرف کھڑے ہو کر اس نے بس ایک لفظ کہا تھا۔

"ایلسا..." انارا تھم گئی۔یہ پکار کیا یہ اسکے لئے تھی؟

وہ اس پکار پر مڑی اب کے اسکا چہرہ مکمل طور پر شاہ ویر کے سامنے تھا۔اس نے ناک میں بالی پہنے ہوئی لڑکی کو دیکھا۔اور وہ کئی لمحے ہل نہیں سکا۔ٹائم اسکوائر کی ساری روشنیاں،سارا حسن،ساری رونق،سارے قہقہے،سب بے معنی تھے۔یہ لڑکی اور اسکا چہرہ شاہ ویر اب اسے اگلی کئی زندگیوں تک بھول نہیں پاتا۔

برف اب بھی ذرہ ذرہ گر رہی تھی۔

★★★★★★★★★★

برف باری مزید تیز ہوتی جا رہی تھی۔روئی کے گولے اسکے سیاہ بالوں میں جگہ جگہ اٹک کر رہ گئے تھے۔وہ اچھنبے

سے اپنے سامنے کھڑے مرد کو دیکھ رہی تھی۔اسکا قد آراہ سے چند انچ لمبا تھا،چہرے پر ماسک لگا تھا اور پی کیپ سے اسکی آنکھیں بامشکل نظر آ رہی تھیں۔گردن میں مفلر،اور سفید اوور کوٹ والا شخص اسے اجنبی اور (امیر) لگا۔

"آپ مجھ سے بات کر رہے ہیں؟" آراہ نے انگریزی میں پوچھا۔ساتھ ذہن میں جمع تفریق کرتی رہی، کیا وہ اسے جانتی تھی؟(یاد کر آراہ،بعد میں بے عزتی نہ ہو جائے)

"تم اس رنگ میں ہمیشہ مجھے ایلسا کی یاد دلاتی ہو!" اسکے اردو میں کہنے پر آراہ الجھی۔ آواز جانی پہچانی تھی، وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے اسے جانتا ہو۔ کیا وہ واقعی جانتا تھا؟ کہیں یہ کوئی انڈین تو نہیں جو پاکستانی ہونے کی وجہ سے ۔۔۔۔۔ آہ آراہ آہ چپ کرو پلیز۔ اس نے دماغ میں ابھرتے بے کار خیالوں کو ڈپٹا۔

"کیا آپ مری سے ہیں؟" شاہ ویر کے دوبارہ پکارنے پر وہ چونکی تھی۔ وہ شاید بات کرتے ہوئے مسلسل مسکرا رہا تھا کیونکہ اسکی آنکھیں چھوٹی ہو رہی تھیں۔

"آئی ایم سوری شاید میں آپ کو نہیں جانتی اور میں اجنبیوں سے بات نہیں کرتی۔" وہ رکھائی سے کہتی آگے بڑھنے لگی۔ دل میں ہزار وسوسے، ہزار اندیشے تھے۔ اسکی سوتیلی ماں نے اسے بتا رکھا تھا کہ نیویارک کی سڑکوں پر آج کل کچھ عجیب لڑکوں کا گروہ آوارہ گردی کرتا ہے۔ لڑکیوں کو ہراساں کر کے انکی ویڈیوز سوشل میڈیا پر بھی ڈال دیتے ہیں۔ کچھ تو لوٹ بھی لیتے ہیں۔ آہ اسے کسی رہزن سے نہیں ملنا تھا۔

کیا وہ۔۔۔۔؟ کہیں یہ ان میں سے ایک تو نہیں؟ آج تو میں اچھی بھی نہیں لگ رہی۔ کیا مطلب؟ اچھی لگنے کا کیا تعلق ہے؟ آہ آراہ کم سوچو۔

وہ دل ہی دل میں خود کو ڈپٹتی تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ سرخ سیڑھیاں پیچھے رہ گئی تھیں اب وہ ہلال فوڈ پوائنٹس سے گزر رہی تھی۔ شاہ ویر ہنوز چند قدم کے فاصلے سے اسکے پیچھے تھا۔ وہ ایک مہذب تعاقب کار لگ رہا تھا۔ گو کہ کوئی بھی تعاقب کار مہذب نہیں ہوتا لیکن نہ جانے کیوں اسے اپنے پیچھے آتا دیکھ آراہ کے جی میں آیا تھا کہ رک کر پوچھے۔۔۔۔۔

"تمہاری آواز اتنی شناسا کیوں ہے؟" وہ دل ہی دل میں اپنی تمام دوستوں کے "بھائی" اور "بوائے فرینڈز" کے چہرے دماغ کی سکرین پر لاتی پھر رد کرتی۔ اونہوں یہ ان میں سے ایک نہیں تھا۔ سارے ہی بھینگے اور الگ ہی نمونے تھے۔

آراہ کے تیز تیز قدم ذرا فاصلے پر ایک جگہ رک گئے تھے۔ وہ سیاہ ماسک والا لڑکا کہاں تھا اسے خبر نہیں تھی وہ بس گرتی ہوئی برف، آنکھوں کو خیرہ کرتی روشنیوں اور ہنستے مسکراتے لوگوں کے درمیان ٹھہر گئی تھی۔ مبہوت سی وہ اپنے سامنے ایک پرفیوم سٹور کو دیکھ رہی تھی۔ پرفیوم کی بوتلیں ہی اسکے لیے لمحہ جمود ثابت ہوتی تھیں، چند پل کے لئے بس سب کچھ بھول کر کھو جاؤ۔ اسکے پاس تقریباً پانچ سو بوتلیں جمع تھیں لیکن دل تھا کہ بھرتا نہیں تھا۔ استعمال وہ ایک بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن ۔۔۔۔۔۔۔ محبت تو پھر محبت ہے۔

"کیا تم واقعی مجھے نہیں جانتیں؟" عقب سے آتی آواز پر وہ ٹھٹھکی۔ ڈھیر سارا تھوک نگلا، پرس دبوچ کر سینے سے لگایا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی تھا۔ وہی برف جیسا سفید اوورکوٹ، سیاہ پی کیپ، وہی مسکراتی آنکھیں۔ اور اس سے اٹھتی مسحور کن خوشبو۔

"میں یہاں سے پرفیوم لینے آیا ہوں لیکن ۔۔۔۔۔۔ میں تم سے دو بار مل چکا ہوں۔ کیا تم واقعی مجھے نہیں جانتیں؟" وہ پچھلے چھ ماہ اسکے حصار سے نہیں نکل سکا تھا۔ کچھ تھا اس میں کہ وہ شاہ ویر کی زندگی میں ایک حصہ بنا گئی تھی۔ اسے یہاں کھو دینا، ہمیشہ کے لیے کھو دینے جیسا تھا اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ (لیکن اگر وہ احمد اب بھی اسکا بوائے فرینڈ ہے تو میں موو آن کر جاؤں گا) اس نے دل میں سوچا۔

"کیا تم مجھے اسٹالک کر رہے ہو؟" بھاڑ میں گیا لحاظ مروت، وہ سلگ کر پوچھ رہی تھی۔ نامحسوس انداز میں اس نے پرس کھول کر پیپر اسپرے ہاتھ میں دبوچ لیا تھا۔ (آج تو اسکی آنکھیں میں سرخ گلاب سے زیادہ سرخ کروں گی)

"اسٹالکنگ کا ایک سنہری اصول یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہدف کو بھیڑ سے دور تلاش کرو۔"

"اور اس اصول کے باوجود تم مجھے اتنے سارے لوگوں کے درمیان ہراساں کر رہے ہو؟" (آج تو پیپر اسپرے کے دس ڈالرز کا حساب چکتا ہو کر رہے گا، انشاءاللہ)

"میرے سر پر اگر بے وقوف لکھا ہوتا تو میں ایسا ضرور کرتا لیکن میں ماشاءاللہ سے جینئیس پیدا ہوا تھا۔"

"اس لیے تم نے اسٹالکنگ کے پرانے اصولوں پر لعنت بھیجتے ہوئے چند دیدہ دلیر اصول ایجاد کر دیے؟" اچھی خاصی کھٹر کی خریداری() window shopping ہو رہی تھی پتا نہیں کہاں سے یہ نمونہ ٹپک پڑا۔

"میرے اصولوں سے تم بہت جلد واقف ہو جاؤ گی لیکن میں تمھیں اسٹالک نہیں کر رہا۔ہم پہلے مل چکے ہیں۔کتابوں کے درمیان۔جانتی ہو جو لوگ کتابوں کے درمیان ملتے ہیں وہ بالکل کتابوں جیسے ہو جاتے ہیں۔"

آس پاس کے رش سے بے نیاز وہ اسے باتوں میں الجھا کر اسکے ساتھ کچھ وقت گزار رہا تھا۔کیوں یہ تو وہ بھی نہیں جانتا تھا۔

"کتابوں جیسے کیسے؟" (تو ذرا کچھ بول اور دیکھ میں کیسے تیری آنکھیں لال کرتی ہوں)

"ان مٹ، یادگار، خوشگوار۔" اس نے گنوایا۔"پیپر اسپرے کی جان چھوڑ دو مجھ جیسے شرفاء پر ضائع ہو گا استعمال نہیں۔" پرس دبوچے کھڑی آراہ پر مانو اوس پڑ گئی۔ مگر وہ گردن تانے کھڑی رہی۔

"میں آپ کو نہیں جانتی۔" وہ اپنے سابقہ روکھے اور بے لچک انداز میں بولی۔"اپنے ذہن پر زور دینے کے باوجود مجھے آپ یاد نہیں آ رہے اس لیے برائے مہربانی مجھ سے فاصلہ رکھیں۔" وہ رکی۔۔۔۔۔"اتنے مہذب تو آپ ہوں گے ہی کہ کسی کے منع کرنے کے بعد آپ اسکے پیچھے نہ جائیں۔"

شاہ ویر نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ہاتھ سینے پر رکھا، اور گردن کو ہلکا سا خم دیا۔"آف کورس محترمہ!"

"اور اس سٹور کے قریب بھی نہ جائیں جہاں آپ کو میں نظر آؤں۔"

"آپ بس حکم کریں۔"

"اور مجھے دیکھ کر راستہ بدل لیں۔"

"جو آپ کہیں۔"

تابعداری سے کہا۔ آراہ چند لمحے مشکوک نظروں سے اسے دیکھتی رہی اور پھر اسکے سامنے سے گزر کر چلی گئی۔ پرفیوم سٹور کی روشنیاں شاہ ویر بنگش کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔ وہ مڑ مڑ کر اسے دیکھ رہی تھی اور شاہ ویر دل سے ہنس رہا تھا۔ انارا طارون اس شخص سے غیر محفوظ ہو رہی تھی جس نے چھ ماہ اسکے خیال کی بھی حفاظت کی تھی۔

حال میں واپس آؤ تو سہر اب کا چہرہ وہ نہیں تھا جس کے ساتھ وہ یہاں آیا تھا۔ رشتہ آیا نہیں تھا لیکن اسکی طرف سے نامنظور تھا۔ وجہ؟

انارا کا مسیحا مستقبل کا مقتول بننے جا رہا تھا، جلد بہت جلد۔

★★★★★★★★★★★★

"نیو یارک"

ہمہ وقت کسی کے تعاقب کا خوف، گاڑی سے بچھوؤں کے ڈبے ملنا، موبائل پر غیر شناسا نمبرز سے اسکی اپنی ہی تصاویر اور دھمکیاں بھیجے جانا، کبھی اسکے کمرے کی کھڑکی کے باہر دھمکی آمیز خطوط چھوڑ جانا، کبھی ہڈیوں کا سورما اور کبھی کچھ انسانیت سے گئی گزری، تشدد اور زیادتی کی ویڈیوز بھیجنا یہ سلسلہ پچھلے چند ماہ سے شروع ہوا تھا۔ لاہور سے لندن اور لندن سے نیو یارک اس نے تین شہر بدلے مگر بے سود۔۔۔۔۔ کوئی تھا جو سرحدوں کی قید سے آزاد تھا، جس کے پاس پیسہ تھا، تعلقات تھے، عقل تھی اور جس کے پاس شاہ ویر بنگش کی کمزوری تھی۔ "زندگی" سے بڑی کمزوری کیا ہو سکتی ہے؟

عین ممکن تھا کہ وہ ان فکروں میں دنیا سے بے نیاز ہو جاتا مگر اس نے خود کو دنیا میں غرق کر لیا فلحال وہ ان فکروں کو ترک کیے بیٹھا تھا۔ (فکر کرنے سے کونسا کوئی مسئلہ حل ہو رہا تھا)

نیو یارک کی روشنیاں ساری دنیا میں مقبول ہیں۔ یہ شہر اپنے اندر ایک دنیا سموئے ہوئے ہے۔ یہاں دن تو دن

راتیں بھی جاگتی تھیں ۔ کیفیز ،بار ،نائٹ کلبز ،اور مختلف سیاحتی مقامات پر رونق رہتے۔نیو یارک اچھا میزبان ہے۔اپنے مہمانوں کو بور نہیں کرتا۔انہی روشنیوں میں گھرے ،موسیقی کے بے ہنگم شور سے ذرا دور ،بار کی رنگین دنیا سے کوسوں پرے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی بالکنی اس وقت ایک شخص کی موجودگی لئے ہوئی تھی۔بالکنی کے اطراف میں شیشے کی دیواریں تھی۔یہ ایک شاہانہ سویٹ تھا۔شاہ ویر بنگش نے اپنی زندگی میں اعلیٰ اور عظیم سے کم کچھ نہ پایا تھا۔بالکنی sea through تھی۔دیواریں اور فرش دونوں شیشے کے۔اگر نیچے کی طرف دیکھو تو ہوٹل کے باہر آتے جاتے لوگ یہاں سے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ اس شیشے کی بالکنی میں رکھے صوفے پر بیٹھا تھا۔لیپ ٹاپ گود میں تھا اور خود وہ نیم دراز تھا۔ساتھ رکھی چھوٹی سی شیشے کی میز پر اس کے کھانے کے برتن رکھے تھے۔ساتھ ایک ادھ کھلا جوس کا ڈبہ۔وہ کھٹا کھٹ ٹائپ کر رہا تھا۔دماغ سارا اس سین کی طرف تھا جس میں ہیرو نے ہیروئن کو گلاب بھیجے تھے۔(تُو صبر کر بیٹا ابھی یہ جب دھوکہ دے گی تب پتا چلے گا)وہ اپنے ہی کردار کے مستقبل کا سوچتے ہوئے محظوظ ہو رہا تھا۔سر الگ دھن رہا تھا۔

اسکا موبائل بند تھا اور اس نے چارج کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔(چارج کروں گا تو پھر سے ریلز دیکھنے لگوں گا،کام گیا بھاڑ میں)اسی ایک سوچ کے چلتے اس نے موبائل کونے میں ڈال دیا۔ماشاءاللہ۔

وہ لکھنے میں مکمل طور پر غرق تھا جب اسے ایک مانوس سی آواز آئی۔اس کی لکھتی انگلیاں تھمیں شاہ ویر نے کان لگا کر سنا۔آواز دوبارہ آئی۔اس نے فوراً مسودہ محفوظ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔بالکنی سے سارا نیو یارک نظر آتا تھا لیکن وہ اس منظر کو لاکھوں بار دیکھ چکا تھا۔اس وقت وہ اس آواز کے تعاقب میں تھا۔جلد ہی اس نے سراغ لگا لیا۔اس کی ساتھ والے سویٹ کی بالکنی اور اسکے اپنے سویٹ کی بالکنی کے درمیان کرسمس کے موقعے کی مناسبت سے کچھ سجاوٹی تاریں لگی تھیں۔رنگین روشنیاں پیدا کرتی تاریں۔لیکن اس وقت اس کی توجہ کا مرکز ان تاروں پر بیٹھا بلی کا چھوٹا سا بچا تھا۔اگر وہ یہاں سے گرتا تو اسکی موت یقینی تھی۔اسکی آنکھوں کا خوف،اسکا کپکپانا،شاہ ویر کا دل پسیجا۔

"ڈونٹ وری، تم ہلنامت میں تمھیں سنبھال لوں گا۔" اس نے انگریزی میں کہا۔

بلی کا بچہ زور زور سے آوازیں نکالنے لگا تھا۔ شاہ ویر کو سمجھ نہ آیا کہ وہ کس طرح اسے بچائے۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی، کہ شاید اسکی پریشانی کم ہو۔ سفید بلی کا بچہ گھبرایا ہوا تھا۔ شاہ ویر نے بالکنی سے آدھا باہر لٹک کر اپنا ہاتھ تاروں کے اوپر یوں پھیلا لیا جیسے ہتھیلی پر اسے بیٹھنے کی پیش کش کی ہو۔ بچہ سہما گھبرایا سا آگے آیا۔ شاہ ویر کے سینے پر شیشے کا دباؤ تھا۔ ہاتھ بری طرح سرخ پڑ رہا تھا۔ گردن پر زور پڑ رہا تھا اور صبیح پیشانی پر بل تھے اسکی گردن یوں جیسے گردن چھل رہی ہو لیکن cat parents عجیب مخلوق ہوتے ہیں۔ وہ بالکنی سے آدھا لٹک کر بھی مسکرا رہا تھا۔ یہاں تک کہ بلی کا وہ بچہ اسکی ہتھیلی پر آ بیٹھا۔ شاہ ویر اپنی فتح پر مسکرایا تھا۔ اس نے بچے کی ٹانگ کو انگلیوں میں دبوچا اور جلدی سے اسے اوپر اٹھا لیا۔ اور بالکنی کے فرش پر گر گیا۔ گھبرایا بچا اس سے لپٹنے کی کوشش میں اسکی گردن زخمی کر گیا۔

"ریلکس، سب ٹھیک ہے ریلکس۔" شاہ ویر نے اسے سہلایا۔ وہ اسے بچا چکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ see through شیشے کے اوپر لیٹا تھا۔ جمبو (بلی کے بچے کو نام مل چکا تھا۔) اس کے سینے پر لیٹا ہوا تھا۔ دور بیڈ پر شاہ ویر کا ڈیڑھ برس کا بلا "شاہ جہاں" لیٹا تھا۔ اسکے اٹھنے کی دیر تھی جمبو بہت جلد ادھ کھلی بوتل بننے والا تھا۔ دور پڑا لیپ ٹاپ اپنی ناقدری کو رو رہا تھا۔ شاہ ویر جمبو کے ساتھ کھیلتے ہوئے اپنے مسودے کو کہہ رہا تھا۔ "دیکھو میں نے تمھیں لکھنے کی پوری کوشش کی۔ لیکن کسی کی جان بچانا بھی ضروری تھا۔ تم اتنے ظالم تو نہیں ہو ناں؟" بس ایک موقعہ صرف ایک موقع، ایک بہانہ چاہیے ہوتا ہے لکھاری کو کہ وہ اپنے کام سے بھاگ سکے۔ پانچ منٹ کے کام کو پہلے وہ پندرہ منٹ کا بنائے گا، پھر سوچے گا اب کچھ کھا لیا جائے، یا پھر تھوڑا ٹہل لیا جائے۔ مسودہ چاہے منہ پھلائے ایک کونے میں پڑا رہے۔ وہ اگلے چند مزید گھنٹے یونہی لیٹے لیٹے گزار دیتا اگر اس کے لیپ ٹاپ پر اس کے بھائی کی کال نہ آ رہی ہوتی۔ وہ کھیلتے ہوئے سخت بدمزہ ہوا۔ لیکن نظرانداز نہیں کر سکا۔

بازو کو موڑ کے جمبو کو اس پر بٹھایا اور دوبارہ آ کر صوفے پر گر گیا۔ کال اٹینڈ کر لی اور بلے کے ساتھ لیپ ٹاپ بھی

سینے پر دھر دیا۔ سکرین کو دیکھتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے دل پر ٹھنک پڑی ہو۔ کال شروع ہو چکی تھی لیکن اپنے کمرے میں کھڑا زید اپنے کاغذات جوڑتے ہوئے بس اسے گھورے جا رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں تھامے کاغذات جوڑ کم انہیں دبوچ زیادہ رہا تھا۔

"ایسے مت دیکھو یار، مانا میں پیارا ہوں لیکن شرم بھی تو آتی ہے۔"

"بکو مت بے غیرت نہ ہو تو۔" زید گرجا۔

شاہ ویر ڈھٹائی سے ہنسا۔ "اچھا اس سے ملو یہ۔۔۔۔"

"یہ تمہارا باپ طلال بنگش ہے ناں؟" وہ بگڑا۔

"استغفر اللہ، کیسی باتیں کر رہے ہو؟" اسکی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ کسی کا ضبط آزمانا اسکے پسندیدہ کاموں میں صف اول پر آتا تھا۔ "باپ کو کیوں بیچ میں لا رہے ہو یہ میرا بیٹا ہے، جمبو بنگش۔" اس نے محبت سے شاہ جہاں کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"خبردار جو تم نے اس گلی کے بلے کو میرے خاندان کا نام دیا۔"

"تمہارا خاندان؟ میں لاٹری میں نکلا تھا کیا؟"

شاہ زید نے تین چار موٹی موٹی گالیاں زبان پر آنے سے روکیں اور مزید جارحیت سے کاغذات اکھٹا کرنے لگا۔

"مقصد کی بات پر آؤ گے یا روٹھی محبوبہ کی طرح دیکھتے رہو گے؟" شاہ ویر نے گردن پر انگلیاں تھپتھپائیں۔ خراشیں جل رہی تھیں۔

"مجھے یہ بتاؤ تم نے سستے نشے کب سے شروع کر دیے ہیں؟ عالمی سطح پر بیٹھ کر اپنے معشقوں کا اقرار کون کرتا ہے؟"

"شاہ ویر طلال بنگش۔"اس نے نادیدہ کالر چڑھائے۔"اور معاشقے میں کئی برس پہلے چھوڑ چکا ہوں یہ والی تو میری محبت ہے۔تمہاری بھابی۔میری ہونے والی بیوی۔بنگش خاندان کی بہو۔"

"کتنے سال تک؟"

"کیا ہے یار۔۔۔۔"شاہ ویر بگڑا۔"دو سال سے میرے ساتھ ہے وہ۔کئی بار تم سے ملوا چکا ہوں۔اسکے گھر اسکی فیملی سے ملنے جارہا ہوں اور تمھیں لگتا ہے میں سیریس نہیں ہوں؟"

شاہ زید لمحے بھر کو چپ ہو گیا۔اسکے دماغ کی سکرین پر کوئی اور منظر ابھر رہا تھا۔

"تم اس لڑکی کو جانتے ہوناں،زید؟"رات کے کھانے پر جب تمام بنگش مل بیٹھے تب تمکنت نے چھری کانٹے سے پاستالبوں تک لے جاتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔

وہ اپنے بیٹے کو نہیں دیکھ رہی تھیں اسکی نظریں کھانے پہ جمی تھیں۔ایک پل کو تو زید نہیں سمجھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔لیکن اگلے ہی پل اسکے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔ایک جھٹکے سے اسے اس لڑکی اور اس سے جڑی ساری باتیں یاد آگئیں۔

،"کیسی لڑکی ہے وہ؟"تمکنت نے پھر پوچھا۔

"خوبصورت،وفادار،اور اونچی ناک والی۔"شاہ زید نے بغیر دقت کے گنوایا۔وہی جو وہ جانتا تھا،یا اسے لگتا تھا۔

"کیا وہ میر کارواں کے ساتھ چل سکتی ہے۔؟کیا وہ لوگوں کے معاملے میں اچھی ہے؟"دوسرا سوال انداز ہنوز مصروف۔اب کے رئیس کے کان بھی اسی طرف لگ چکے تھے۔اوہو خاندان میں ایک نیا ڈرامہ ہونے والا تھا۔

"میر کارواں کے ساتھ چلنے والوں کی پہچان میر کارواں بناتا ہے مام۔جہاں تک مجھے لگتا ہے"وہ"اسکے چلتے رہنے کا حوصلہ ہے۔"

تمکنت نے اب بھی سر نہیں اٹھایا۔

" ھمممم ماں باپ کیا کرتے ہیں اسکے ؟"

" مام وہ میری نہیں ویر کی گرل فرینڈ ہے آپ کو یہ سب اس سے پوچھنا چاہیے۔" وہ اکتایا۔

شاہ زید نے اب کے الجھ کر اپنی ماں کو دیکھا تھا پہلے تو کبھی اتنے سوال نہیں کئے گئے تھے۔"خیر اسکے پیرنٹس علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں۔"تمکنت نے محض سر ہلا دیا۔

" مام آپ کیا سوچ رہی ہیں ؟" وہ پوچھ ہی بیٹھا۔ البتہ رئیس پوچھے بغیر بھی جانتا تھا اب اسکی ماں کیا کرے گی۔ وہ واقعی اپنی ماں کا بیٹا تھا۔

شاہ زید کے سوال پر اسکی ماں نے نگاہیں اٹھائیں۔

"،وہی جو وہ ڈیزرو کرتی ہے۔ شاہ ویر سے علیحدگی۔ وہ بہتر کا حقدار ہے۔"

"شاہ ویر اسے کبھی نہیں چھوڑے گا مام۔"

"میں نے کب کہا ویر اسے چھوڑے گا؟"

وہ نزاکت سے کہتی اٹھ گئی۔ رئیس نے آسودگی سے صوفے سے ٹیک لگالی۔ مٹھی لبوں پر رکھے وہ مسکراہٹ روکنا چاہ رہا تھا۔ ایسی کمینی خوشی ہوئی تھی کہ جسکی کوئی حد نہیں۔ جہنم میں جائے ڈرامہ انڈسٹری اصل شو تو آشیانہ بنگش میں لگتا تھا۔

"مام کیا کریں گی بھائی؟" زید اب بھی پریشان تھا۔

رئیس نے اسکا کندھا تھپکا۔ "مام وہی کریں گی جو وہ ڈیزرو کرتی ہے۔"

"مثلاً کیا؟" اس نے دانت کچکچائے۔ سخت غصہ آ رہا تھا اسے۔

"وہ اونچی ناک والی بغیر ماں باپ کے رہنے والی لڑکی ہے۔ مام اسکی ناک نیچے کریں گی۔one dollar girl کو اسکی اوقات یاد دلائیں گی۔ اور پھر شروعات ہو گی اسکی کمزوری سے۔"

زید نے بے یقینی سے اپنے بھائی کو دیکھا۔ رئیس نے اثبات میں سر ہلاتے کہنا جاری رکھا

"مام اس کے سامنے شاہ ویر کا وہ امیج رکھیں گی جو اس لڑکی کے باپ کا تھا۔" شاہ زید کا دل دھک سے رہ گیا۔ "کوئی بھی انسان اپنے برے ماضی کو اپنے پسندیدہ انسان کی شکل میں دوبارہ نہیں دیکھے گا۔ مام ٹھیک کہہ رہی ہیں شاہ ویر اسے نہیں چھوڑے گا۔ وہ شاہ ویر کو چھوڑے گی۔I am so excited"

زید کتنے ہی لمحے کچھ کہہ نہیں سکا۔

"زید کیا ہوا ہے؟" جمبو کو صوفے پر ڈالے لیپ ٹاپ اپنے ہاتھ میں اٹھائے وہ کچن کی طرف آیا۔

"مجھے لگتا ہے مام اسے قبول نہیں کریں گی۔" زید دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"وہ مام کی پروڈکشن ہاؤس میں کام کرنے والی دو ٹکے کی اداکارہ نہیں، میری ہونے والی بیوی ہے اس کی طرف اٹھتی نظر، اور اٹھتے ہاتھ کیسے روکنے ہیں یہ آتا ہے مجھے۔" اس نے کافی میکر چلاتے ہوئے کہا۔ چہرے پر اگر کچھ تھا تو سنجیدگی۔

"تم اپنے ساتھ ساتھ اسکے مسائل بھی بڑھا دو گے۔"

"میں بذات خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہوں۔ ڈیڑھ سال سے مجھ سے نباہ کر رہی ہے آگے بھی ہر مسئلے سے کر لے گی۔" اس کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔ سوال ختم ہو سکتے تھے مگر شاہ ویر کے جواب نہیں۔ سارے وقت میں زید پہلی بار پر سکون ہوا۔

"یعنی میں اسے بھابی مان لوں؟"

"یہ لو، میں نے بچوں کے نام تک سوچ لیے ہیں اور تم اب تک کہاں اٹکے ہو؟" شاہ ویر مسکراتے ہوئے بولا۔ زید نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ "ویسے شیروانی کس رنگ کی پہنوں یار؟"

"یار تم تو سوٹ میں زیادہ اچھے لگو گے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں شیروانی کینسل۔" کافی کا کپ بھرتے شاہ ویر نے تائید کی۔ شاہ زید مسلسل ہنس رہا تھا۔

"تم نے سب بتا دیا یہ نہیں بتایا کہ تم دونوں ملے کہاں تھے؟"

یہ سوال شاہ ویر بنگش کو ڈھائی برس پیچھے لے گیا۔ "وہ خود بھی نہیں جانتی میں نے اسے پہلی بار کب دیکھا تھا۔ دوسری بار کب، اور تیسری بار کب۔"

★★★★★★★★★★★★★

"ڈھائی سال قبل، مری۔"

اخبار کے تراشوں والی چھت اور گلاس وال والا برطانوی طرز کا کیفے اس وقت لوگوں کی موجودگی سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیفے کے بڑے سے ہال میں قطار در قطار کرسیاں لگی تھیں اور جہاں کرسیاں ختم ہو رہی تھیں وہاں ذرا سا اونچا چبوترا بنا تھا جہاں لکڑی کی میز کے پیچھے رکھی کرسی پر اس محفل کا سب سے خاص انسان بیٹھا تھا۔ چاروں اور گلاس وال اور گلاس وال کے اوپر لگی بانس کی سیلنگ سے لٹکتی فیری لائٹس اس وقت ماحول کو خوابناک سا منظر دے رہی تھیں۔ باہر برف باری عروج پر تھی، اندر آتش دان روشن تھا اور باتوں کی بھنبھناہٹ تھی۔ اوور کوٹ، شال، اور سوئیٹر پہنے لوگ ہال میں بیٹھے سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کوئی تیئیس، چوبیس برس کا نوجوان تھا۔ اس نے سفید رنگ کا ہائی نیک سوئیٹر پہن رکھا تھا۔ ہلکے فیروزی رنگ کا اوور کوٹ کرسی کی

پشت پر ٹنگا تھا۔ بھورے بال اسکے ماتھے پر گر رہے تھے۔ اور اسکی لمبی سفید انگلیاں کتابوں پر دستخط کرتی جا رہی تھیں۔ دفعتاً اس نے گردن اٹھا کر لوگوں کو دیکھا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ دستخط کرتے ہوئے میرے ہاتھ اتنے تھک جائیں گے تو واللہ میں یہاں کسی کو نہ بلاتا۔ جعلی سائن بھیجتا میں سب کو۔" وہ بے چارگی سے بولا تو لوگ ہنس پڑے۔ ملک کا مشہور ترین انسان ایک چھوٹے سے کیفے میں لوگوں کے درمیان گھرا ہوا، باتیں بگھار رہا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر خوش تھے، اسے سن کر محظوظ ہو رہے تھے۔ کوئی اسکے ساتھ تصاویر کھنچوانے آتا تو اسکی ہلکی، حوصلہ افزاء مسکراہٹ کا مداح ہوئے بغیر نہ رہ پاتا۔ غرور اور تنفر تو اسے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔

"شاہ ویر سر آپ نے اپنی زندگی میں سب سے بڑا سبق کیا سیکھا ہے؟" لوگوں میں سے کسی ایک نے پوچھا۔ شاہ ویر نے انہی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"یہی کہ دسمبر کے مہینے میں کتاب دستخط تقریب نہیں رکھنی چاہیے کتابیں تو بک جائیں گی میرے ہاتھ اگلے کئی دن کام نہیں کر سکیں گے۔"

کچھ دیر بعد وہ اس کیفے سے باہر نکل کر جا رہا تھا۔ دونوں طرف باڈی گارڈ تھے جو اسکے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ یخ بستہ ہواؤں سے اسکا اوور کوٹ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ باؤنسرز اسکے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو اس تک رسائی چاہتا تھا۔ اسی پل اس ہجوم میں ایک چہرے پر اس کی بلا ارادہ نظر پڑی۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ چند پل کے لیے وہ ٹھٹھکا۔ پتہ نہیں کیوں اسے لگا کہ یہ چہرہ وہ دیکھ چکا ہے، یا شاید دیکھتے رہنا چاہتا ہے؟

اسکی نگاہ جس پر ٹھہری وہ ایک لڑکی تھی جو فیروزی رنگ کی لمبی مخملی اسکرٹ کے اوپر ہم رنگ اوور سائز سوئیٹر پہنے ہوئی تھی۔ جس کے بازو پھولے ہوئے تھے۔۔ لمبے ہاف کرلز کھلے ہوئے تھے۔ گردن میں سفید رنگ کا مفلر لپیٹ رکھا تھا اور پیروں میں لمبے بھورے بوٹ۔ شاہ ویر بلا ارادہ بے وجہ چند پل اسے دیکھے گیا۔ وہ اس ہجوم میں کھڑی رو رہی تھی، لیکن لوگوں کو دھکا دے کر آگے نہیں آ رہی تھی۔ شاہ ویر ایک لمحہ مزید اسے دیکھتا رہا پھر

آگے بڑھ گیا۔لوگ اس کا نام پکار رہے تھے۔عقیدت سے اس کی گاڑی کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔لیکن وہ لڑکی اس کے پیچھے نہیں آئی۔ بیک ویو مرر میں شاہ ویر نے اس لڑکی کو آنکھیں رگڑتے ہوئے، پھر مجمعے سے ہٹتے ہوئے دیکھا۔اسے بُرا لگا۔ضرورت اور حد سے زیادہ برا۔

"کمال ہو گیا، شاہ ویر مجھے نہیں پتا تھا سب کام اتنے اچھے سے ہو جائیں گے۔"شاہ ویر کے ساتھ بیٹھی اسکی مدیر صالحہ پرجوش انداز میں کہہ رہی تھی۔"یہ جگہ چھوٹی تھی لوگ باہر کھڑے رہ گئے۔لیکن ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا اتنے سارے لوگ سنبھالنا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔"

گاڑی ذرا آگے گئی ہو گی جب شاہ ویر نے ایک نیا حکم صادر کیا۔"گاڑی واپس موڑو۔"

"کہاں واپس؟"صالحہ فوراً سیدھی ہوئی۔

"واپس کیفے۔"شاہ ویر مطمئن تھا۔

"سر رش بہت ہے ہم پھنس جائیں گے۔"ڈرائیور نے اسے باز رکھنا چاہا۔(دل ہی دل اسے جو گالیاں دیں انکا قصہ الگ ہے)

"مجھے لگتا ہے ہم واپس نہ گئے تو میں پھنس جاؤں گا، گاڑی موڑو ابھی۔"وہ تیزی سے بولا۔

یہ وہی تھی باخدا یہ وہی لڑکی تھی جو کچھ عرصہ قبل مری کی کسی سنسان گلی میں اسکی مدد کو آئی تھی۔شاہ ویر اسے پہچانتا تھا،وہ چہرے کبھی بھولتا ہی نہیں تھا۔یہ چہرہ تو وہ آدھی زندگی نہیں بھول سکتا تھا۔وہ اتنی خوبصورت نہیں تھی، لیکن وہ اسکے تعاقب میں جانا چاہتا تھا۔

چند منٹ کے اندر اندر گاڑی واپس اسی شیشے کی دیواروں والے کیفے کے باہر آکر رکی۔فیروزی اسکرٹ والی لڑکی اب کیفے کے باہر رکھے بنچ پر بیٹھی تھی۔شاید برف باری سے بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔فیری لائٹس کی روشنی میں اسکی ناک کی بالی اور رو رو کر سرخ ہو چکی ناک واضح دکھائی دے رہی تھی۔شاید وہ اندر داخلہ نہ ملنے پر

رو رہی تھی۔ اور اب یہی غم لے کر گھر جانا تھا۔ شاہ ویر شیشے کے پار سے اسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں چھوٹی کئے غور سے۔ پھر اپنے ساتھ بیٹھی اپنی مدیر کو دیکھا۔

"اسے یہاں بلاؤ میں اسکی کتاب دستخط کر دیتا ہوں۔"

صالحہ نے غور سے اسے دیکھا وہ مہربان تو تھا، یوں بھی نہ تھا کہ عورتوں کے معاملے میں پارسا تھا لیکن اسکی مقناطیسی کشش صنف نازک کو اپنی طرف خود کھینچ لاتی تھی یہ پہلی دفع تھا جب اصول، اور کشش دھری کی دھری رہ گئی۔ اور وہ راستے بدل کر کہیں کھنچا چلا آیا تھا۔

"جاؤ، صالحہ۔"

اس کے سنجیدگی سے کہنے پر صالحہ گاڑی سے اتر گئی۔ اور بنچ پر بیٹھی لڑکی کی اور بڑھ گئی۔ چند پل بعد وہ واپس آتی دکھائی دی، شاہ ویر کو حیرت ہوئی جب صالحہ کے ہاتھ میں صرف ایک کتاب تھی انارا طارون وہیں بنچ پر بیٹھی رہی۔ شاہ ویر کی گاڑی تاریکی میں تھی، انارا کا وجود روشنی میں۔ مگر وہ شاہ ویر کی گاڑی میں موجودگی سے تو واقف ہو گی۔

"وہ کہہ رہی ہے آپ بس سائن کر دیں۔" گاڑی کے شیشے سے صالحہ نے کتاب اسکی طرف بڑھائی۔ شاہ ویر لاکھ خوش گفتار سہی مگر صالحہ کو لگا تھا وہ اس کتاب پر دستخط نہیں کرے گا۔ (کرنا بھی نہیں چاہیے یہ اسکا ذاتی خیال تھا) لیکن اس نے کتاب لی اور اپنے گھٹنے پر رکھی۔ متحیر نگاہوں سے ایک بار اسے دیکھا، پھر کتاب کو۔

"نام؟"

"نام؟۔۔۔۔۔۔" صالحہ ہڑبڑائی۔ "سوری میں نے تو پوچھا ہی نہیں۔" وہ معذرت کرتے ہوئے واپس انارا تک گئی اور اس سے نام پوچھ کر واپس آئی۔

"اسکا اپنا نام انارا طارون ہے یہ کتاب اسکے کسی عزیز کے لیے ہے "احمد" یہی نام بتایا۔" شاہ ویر نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"احمد اسکا کون ہے؟"

"شاید بوائے فرینڈ۔" صالحہ اندازہ لگاتے ہوئے جزبز ہوئی۔ شاہ ویر اس سے کسی لڑکی کے بارے میں وہ تفصیل پوچھ رہا تھا جو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ ہاں مگر اسے اتنا پتا چل گیا تھا کہ یہ "اطلاع" اسکے باس کو ذرا نہیں بھائی۔

اس نے کتاب پر دستخط کیے اور پہلی بار بغیر کسی دعا یا سلامتی کی سطر کے کتاب اسکی طرف بڑھا دی۔

"عمریں دیکھو اور بوائے فرینڈ بنانا دیکھو، ہنہہ۔" اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔ ایسے جیسے اپنی دل لگی اور محبت کے قصے یاد ہی نہ ہوں۔ کمبخت نہ ہو تو۔

صلہ نے گاڑی کے شیشے کے پار سے کتاب لے لی۔ اور بنچ پر بیٹھی لڑکی کے ہاتھ میں دی۔ شاہ ویر نے انتظار کیا کہ وہ کب مڑ کر اسے دیکھے گی، ایڈیٹر سے منت کرے گی اسے میر کارواں سے ملنے دیا جائے۔ صرف ایک بار ہی سہی بس اسے قریب سے دیکھنے دیا جائے۔ لیکن اسکی حیرت کی انتہا تب نہ رہی جب وہ بغیر گاڑی کی طرف دیکھے کتاب کو ہاتھ میں لئے چلی گئی۔ وہ ششدر رہ گیا۔ یہ تو پہلی بار ہوا تھا۔ صالحہ نے مسکراہٹ دبائی، شاہ ویر کے باڈی گارڈز ہنسی روکنے کی خاطر مزید تن کر کھڑے ہو گئے، ڈرائیور بیچارہ قہقہے کا گلا گھونٹنے کے چکر میں کھانسنے لگا۔ شاہ ویر اب تک صدمے میں تھا۔ یوں نہیں تھا کہ لوگ اسے صرف لکھاری کے حوالے سے جانتے تھے۔ کبھی کسی لڑکی نے شاہ ویر کو دیکھا ہو اور پھر چند لمحے ٹھہر کر دیکھا نہ ہو، یا ایک عدد مسکراہٹ سے اسکو نوازا نہ ہو یہ کبھی نہ ہوا تھا۔

وہ صدمے سے جاں بحق ہو جائے اس سے پہلے کہانی کے دوسرے رخ کی طرف جانا چاہیے۔

واپس نیویارک کے اس ہوٹل سویٹ میں قدم رکھو تو شاہ ویر سارا قصہ سنانے کے بعد اب الوداعی کلمات کہتے ہوئے کال بند کر رہا تھا۔ جمبو کو بازو میں اٹھائے وہ بالکنی سے نکل کر کمرے میں آیا تو پلنگ کے عین بیچوں بیچ ایک

لکڑی کا ڈبہ پڑا تھا۔ بالکل ویسا جیسا اس روز گاڑی میں ملا تھا۔۔شاہ ویر کا سانس جہاں تھا وہیں تھم گیا۔ آنکھیں چند لمحہ متحیر رہیں۔ پھر تاثرات بدلے۔ غصہ، بے بسی، دونوں ایک ساتھ آن وارد ہوئے۔ پھر بے بسی نے جیسے ہر دوسرے جذبے کو ساکن کر دیا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتا پلنگ کی طرف بڑھ آیا۔ لکڑی کا بھورا ڈبہ جس کے اوپر چاقو سے کٹ کے نشان تھے۔ ڈبہ اونچا اور چوڑا تھا۔ جس کے اوپر سرخ ربن بندھا تھا۔ اس نے جمبو کو نیچے چھوڑا، شاہ جہاں کو بازوؤں میں بھر کر پلنگ سے اٹھا کر صوفے پر سلایا اور خود ڈبہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اسکا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کانوں میں کوئی آواز گونج رہی تھی۔ جو یقیناً اسکے حواس معطل کر رہی تھی۔

(پریویلیج کلر یہ اصطلاح نئی نہیں ہے۔ پچھلے دس سالوں میں ہونے والے سترہ قتل اور ایک ہی طریقہ کار۔ قتل سے چند ماہ پہلے ملنے والے لکڑی کے ڈبے، کسی گڑیا کے جلے ہوئے یا زخمی مجسمے، سڑی ہوئی بدبودار کھوپڑی، قتل سے پہلے ہونے والا مسلسل تعاقب۔ اور پھر قتل۔ ایک بے حد بھیانک اور روح فرساں قتل۔)

اس نے مرے مرے ہاتھوں سے اس ڈبے پر لگی ربن کو کھولا۔ ڈھکن ہٹایا۔ اندر ایک انسانی شکل ڈھانچہ تھا۔ بری طرح مسخ شدہ۔ آنکھیں نکلی ہوئی، چہرے پر جابجا زخم اور ہونٹ ادھ کٹا۔ شاہ ویر آنکھوں میں وحشت لیے پیچھے ہوا۔ اسکی آنکھوں میں بے تحاشا خوف تھا، چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑ رہا تھا۔ وہ اٹھا اور واشروم کی طرف بڑھا۔ اندر آکر دروازہ بند کیا، چند لمبے گہرے سانس لئے اور نل کھول کر پانی ہتھیلیوں میں بھرتا چلا گیا۔ اسی لمحے عین اسی لمحے اسکا سانس اسکے سینے میں کہیں اٹک گیا۔ کسی نے باتھ روم کا دروازہ اسکے عقب میں زور سے بند کر دیا تھا۔ وہ سانس نہیں لے سکا۔ نل سے گرتے پانی کا شور اسکے لیے اعلان قتل تھا۔

(سترہ قتل.... سترہ لڑکوں کے قتل وہ جن کی عمریں بائیس سے ستائیس سال تھی۔ اور انکے خاندان ملک کے امیر کبیر خاندان تھے۔ تمام لڑکے کسی اونچے مقام پر تھے۔ سب کا طریقہ قتل ایک ہی۔ سینے پر چاک، گردن ادھ کٹی ہوئی۔ اور موسم بہار کا۔ کیا یہ کوئی اتفاق ہے یا واقعی کسی سیریل کلر کا کام؟ اور اگر وہ کوئی سیریل کلر ہے تو اسکا اگلا

شکار کون ہے؟)

وہ دیوانہ وار دروازہ بجا رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ اسکے چہرہ پر ہراساں تاثر تھا۔ اس نے کندھے سے دروازے کو دھکے دینے شروع کیے مگر دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسی لمحے عین اسی لمحے کسی نے باہر سے کھڑے ہو کر باتھ روم کی دراڑ سے اندر کی طرف کچھ اچھالا تھا۔ شاہ ویر کے قدموں کے نیچے چپچپاہٹ ہوئی۔ اس نے بے اختیار نیچے دیکھا۔ خون کی ایک ندی اسکے پیروں میں بہہ رہی تھی دونوں پیر خون سے بھر گئے، قرمزی سیال ہر طرف پھیلتا چلا گیا۔ دل اچھل کر حلق میں آیا تھا اور وہ مزید دیوانگی سے دروازہ پیٹنے لگا۔ اسکی آنکھوں سے اب آنسو بہہ رہے تھے۔ اسے موت سے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے بس یہاں سے باہر آنا تھا بس یہاں سے نکلنا تھا۔ اسے جینا تھا۔ زندگی یوں اس طرح ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ نہیں ہرگز نہیں۔

(حیرت کی بات یہ قتل نہیں ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ وہ تمام وکٹمز صرف پاکستان میں دھمکائے نہیں گئے۔ انہوں نے ملک چھوڑ دیا مگر پریولیج کلر سے پیچھا نہیں چھڑوا سکے یہاں تک کہ تین وکٹمز اس حد تک عاجز آ چکے تھے کہ انہوں نے خود مارنے کے مختلف طریقے ڈھونڈنے شروع کر دیے۔ موت نہیں، انہیں موت کے خیال نے ہی مار دیا تھا۔)

اس نے شاور کھولا، باتھ ٹب کے نلکے کھولے، واش بیسن کا نل کھولا وہ ہاتھوں میں پانی بھر بھر کر فرش پر گرا رہا تھا۔ اسے بس کسی طرح اس خون سے چھٹکارا چاہیے تھا۔ یہ وہ شاہ ویر نہیں تھا جو لوگوں کے درمیان چلتا تھا تو لوگ اسے ٹھہر کر دیکھتے تھے۔ یہ جان کے خوف سے مرتا ایک عام سا انسان تھا جس کے خواب ملیامیٹ ہو رہے تھے۔۔ باتھ روم میں سنک کے اوپر بنے دراز سے کوئی چابی نکالتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا اور اگلے لمحے وہ جنونی انداز میں چہرے پر سفیدی لیے ہوٹل کی راہداریوں میں بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسکے چہرے پر دہشت رقم تھی۔ پیر خون آلود شاہ ویر طلال بنگش اگر کسی شے سے خوف زدہ تھا تو وہ اسکی متوقع موت تھی۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اسے کسی سیریل کلر کا نیا شکار نہیں بننا تھا۔ کوئی اسکے اس قدر نزدیک کیسے ہو سکتا ہے یہ خیال ہی اسکے لئے نری موت تھا۔

(پولیس کی تفتیش، نجی جاسوسوں کی کاروائی کوئی بھی انسان کوئی شے ایسی نہ تھی جس سے اس قاتل کا پتالگایا جا سکے۔ ہر قتل کے بعد ایک سال کا وقفہ اور ایک سال بعد ایک اور قتل۔ کیا یہ قتل یونہی ہوتے رہیں گے ؟ کیا انکی روک تھام کے لیے کوئی آئے گا؟)

اسکے پیروں پر خون کے دھبے اب بھی تھے۔ کئی لوگوں کو دھکے دیتا، سیکورٹی، اسٹاف کو ہاتھوں سے ہٹاتا وہ استقبالیہ ڈیسک کے عقب میں بیٹھی عورت پر غرا رہا تھا۔ اسکے منہ سے الفاظ نہیں کف نکل رہا تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا اسکے کمرے میں کون آیا؟ وہ اس سے کہہ رہا تھا ہوٹل کے مینیجر کو بلوایا جائے، وہ بہت بری طرح خوف زدہ تھا۔ وہ طاقت ور تھا کوئی اس سے بڑھ کر طاقت کہاں سے لایا؟

وہ زیرک تھا کوئی اسکے دماغ سے کیسے کھیل رہا تھا؟ زندگی میں وہ پہلی بار زندہ ہو رہا تھا کوئی اس زندگی کو چھین کیسے سکتا ہے۔

ڈیسک والی لڑکی کرسی سے اتر کر اسکے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ ہوٹل کا عملہ یہاں وہاں سے آتا اسکے قریب جمع ہونے لگا تھا شاہ ویر انگلی اٹھا اٹھا کر انہیں تنبیہہ دے رہا تھا۔ عملے کے کچھ لوگ اسے اپنے سویٹ کی طرف لے جا رہے تھے۔ اسکی چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سویٹ کے کمرے میں آ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک طرف اشارہ کیا اور کسی نے جیسے اسکے منہ پر جوتا دے مارا۔ وہ کتنے ہی لمحے شل رہا۔ نہ وہاں جمبو تھا تھا، نہ وہ ڈبہ، نہ خون اور

نا کسی کے آنے جانے کا کوئی نشان۔ وہ چوکھٹ پر کھڑا رہ گیا۔ ساکت، شل۔

کیا وہ hallucinate کر رہا تھا؟ یا پھر کوئی اس سے دو قدم آگے تھا؟

کیا یہ سب کوئی برا خواب تھا یا حقیقت اسے نگلنے کو تیار کھڑی تھی؟

کیا وہ پھنس رہا تھا، یا پھر وہ پھنس چکا تھا؟

(قتل اور طریقہ واردات میں اس نے آج تک کوئی تبدیلی نہیں کی لیکن پھر بھی وہ ہر دفع بے حد صفائی سے نکل کر بچ جاتا ہے۔وہ اپنے پیچھے ثبوت نہیں چھوڑتا لیکن ایک ہنٹ چھوڑتا ہے۔مقتول کے سینے پر دائرے کا نشان۔اور اسکے بعد کوئی ثبوت ڈھونڈ نہیں پاتا۔پر یو لیج کلر سے آج تک اسکا شکار بچ نہیں سکا۔اسکے پچھلے قتل کو ایک سال مکمل ہو چکا ہے۔کیا وہ واپس آئے گا؟یہ سوال اہم نہیں۔اہم یہ ہے کہ کیا اسکا اگلا شکار اس سے بچ پائے گا؟)

وہ یونہی ننگے پیر سیکورٹی روم میں کھڑا تھا۔سی سی ٹی وی فوٹیجز اسکے لیے کھول دیے گئے تھے۔وہ دیوانگی سے،بے قراری سے سکرین کو تک رہا تھا۔ناخن چباتے ہوئے،سینہ مسلتے ہوئے وہ اب تک کسی آسیب زدہ خواب کا شکار معلوم ہوتا تھا۔

"یہاں سے پیچھے کرو شام پانچ پینتیس تک لاؤ۔"اس نے ایک جگہ نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔

سرپرست نے اچھنبے سے اسے دیکھا۔"آج شام پانچ پینتیس؟"

"کیا تم اونچا سنتے ہو؟"

"معذرت سر مگر ہم نے دو دن پہلے الرٹ دے دیا تھا کہ تین دسمبر شام پانچ سے سات تک سی سی ٹی وی کام نہیں کرے گا۔دراصل ہمارے نیٹ ورک میں کچھ۔۔۔۔۔۔۔۔"وہ اپنی شان میں مزید قلابے ملا رہا تھا لیکن شاہ ویر جیسے پتھر ہو چکا ہو۔کوئی آواز اسکی سماعتوں کے پردے سے گزر کے یادداشت کا حصہ بننے سے انکاری تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھا اسکے بے حد قریب تھا۔اسے اسکے کمرے میں جانے کی اجازت تھی،اسکے پاس الرٹ کا پیغام موجود تھا،وہ کمرے سے سب صاف کر کے منٹوں میں غائب ہو سکتا تھا،وہ شاہ ویر کی گاڑی،اسکے سویٹ تک رسائی رکھتا تھا۔سرپرست کی مزید کوئی بکواس سنے بغیر وہ مرے مرے قدم لیتا ہوا اپنے کمرے میں واپس آیا،دروازہ بند کیا اور۔۔۔۔۔۔۔کئی لمحے اسی طرح دروازے سے پشت جوڑے کھڑا رہا۔اس نے ایک بار پھر نگاہ اٹھا کر کمرے کو دیکھا۔

لکڑی کا وہ ڈبہ وہیں پڑا تھا جہاں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ باتھ روم کی چوکھٹ پر خون اب بھی تھا۔ انسانی چہرہ فرش پر پڑا تھا اور جمبو۔۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی سبز جگمگ کرتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شاہ ویر دروازے کے ساتھ لگتا نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ اسکے سارے بدن پر کپکپی طاری تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، شاہ ویر کے حوصلے پست کر چکا تھا۔

★★★★★★★★★★★★★★★

"دو دن بعد"

اگلے دو دن عجیب بے کلی میں گزرے وہ لعل یمن سے واپس اپنے اپارٹمنٹ آ گئی تھی۔ چاچو اور اسلان واپس مری چلے گئے تھے لاہور جیسے سُونا سُونا ہو گیا ہو۔ صبح یونیورسٹی کے بعد آج اسکا سخن ساز آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن کام مرضی سے ہونے لگیں تو دنیا کے سارے ملازمین ہر فکر سے نبرد آزما ہونے لگیں۔ سخن ساز لاہور کے ڈاؤن ٹاؤن میں واقع ایک زیور سازی کا ادارہ تھا جہاں مصنوعی زیور بنتا، اور ملک کے ہر حصے میں بیچا جاتا تھا۔ آراہ کو اس جگہ ملازمت دلوانے میں اسکے ماموں کا بڑا کردار رہا تھا۔

اس وقت انارا اپنے ڈیسک پر بیٹھی بے زاری سے آس پاس دیکھ رہی تھی۔ بڑا سا ہال جہاں مختلف میزیں لگی تھیں اور انکے گرد لگی شیشے کی باڑ انہیں دوسری میز سے الگ کر رہی تھی۔ ہر میز پر زیور سازی کے مختلف سامان رکھے تھے۔ ہر کوئی سر جھکائے اپنے آلے اٹھائے کام کرنے میں مصروف نظر آ رہا تھا۔ کافی بینز کی کڑوی مہک دماغ کے سیلز کو بیدار کرنے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔

"اتنا فضول سا دفتر بنانے کی تُک کیا تھی؟

کہیں میں نے غلط نوکری تو نہیں شروع کر دی؟

کیا فائدہ عورتوں کی خود مختاری کا یار، مرد کمائے ناں۔

کہیں شاہ ویر کو کچھ ہو تو نہیں گیا؟

ایک منٹ وہ میری کسی بات سے ناراض تو نہیں ؟

مر مرا تو نہیں گیا؟

اسکے خالی دماغ میں فضول سے زیادہ فضول مشورے آرہے تھے اور میز پر پڑے زیور سازی کے سامان اپنا سامنہ لیے اسے تک رہے تھے۔سفید کرتا جس پر سیاہ رنگ کی کڑھائی ہوئی تھی اسکے اوپر سفید ہی وی نیک بٹن سوئیٹر پہنے ہوئے اس نے بالوں کی لمبی چٹیا بنا رکھی تھی۔

"تم نے چاچو سے بات کی ؟"۔اسکی دائیں طرف کندھے کے پاس جھک کر کسی نے کہا تو آراہ اچھل کر سیدھی ہوئی۔بے اختیار ہاتھ دل تک گیا۔وہ چیخ مارتے مارتے رہ گئی تھی۔

"ہاں ہی تم نے ڈرا دیا یار۔۔۔۔"وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ہاتھ اب تک دل پر تھا۔سانس اتھل پتھل ہو گئی۔

"میں نے ڈرایا؟تم خود ذرا حاضر دماغ رہا کرو بی بی۔"ہانیہ نے جوابی وار کیا۔"مجھ سے پوچھو میں کل رات سے کتنی بے چین ہوں جب سے تم نے بتایا ہے کہ تم نے اسلان سے بات کرلی ہے میں تو سوچ رہی تھی کہ۔۔۔۔"

"اس دن کہاں غائب تھیں تم؟یہ نہیں ہوا کہ گھر آکر چاچو کو سلام کرلو مجھ سے مل لو۔"

وہ اپنا پرس اور اسکوٹی کی چابیاں میز سے اٹھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔بھاڑ میں گیا کام اسے گرما گرم کافی چاہیے تھی۔گو کہ یہ آفس کے کام کرنے کے گھنٹے تھے مگر چائے اور کافی کے لیے ملازمین کو کچن تک جانے کی اجازت تھی۔اور انارا اس اجازت کا بلا دریغ استعمال کرتی نظر آتی تھی۔

"میرے پیٹ میں سخت درد تھا۔"اس نے بہانہ گڑھا۔

چلتے چلتے آراہ نے گھور کر اسے دیکھا اور سر جھٹکا۔ ہانیہ کا گھر لعل یمن کے عین سامنے تھا اور جب جب انارا وہاں جاتی ہانیہ کو ضرور بلواتی تھی۔ دو دن پہلے بھی اس نے ہانیہ کو پیغام بھیجا لیکن وہ نہیں آسکی آراہ اسکا عذر بلکہ اسکی ماں کی پھٹکار سمجھ سکتی تھی۔

"ناں تو مینوں اے دس، اکو اک کڑی اے اوتھے تے تِن تِن چھڑے گبھرو جوان۔ تو جاندی چنگی لگیں گی؟ میں محلے نوں کی جواب دینڑا جے؟(ناں تم مجھے یہ بتاؤ ایک ہی ایک لڑکی ہے وہاں اور تین جوان مرد۔ تم اس گھر جاتی اچھی لگو گی؟ میں نے محلے کو کیا جواب دینا ہے؟" انکا عذر اپنی جگہ درست تھا سو آراہ زیادہ اصرار نہیں کرتی تھی۔

"بتاؤ ناں تم نے چاچو سے بات کی؟" وہ دونوں باورچی خانے میں داخل ہوئیں۔ سفید و سیاہ ٹائلز کے امتزاج سے بنا یہ چھوٹا سا باورچی خانہ اپنے چوڑے سینے پر ایک لمبی میز، چند کرسیاں، دو کافی مشین اور ایک عدد چولہے کا بوجھ سہے ہوئے تھا۔ آراہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھی، اسکا انداز تھکا تھکا تھا۔ جیسے وہ کسی گہرے سوچ بچار سے تنگ آگئی ہو۔

"چاچو سے بات کی ہے اور اسکے بعد وہ بات ہی نہیں کر رہے دو دن ہو گئے۔" اس نے ناک کی ہڈی دو انگلیوں کے درمیان دبائی۔ "شاہ ویر میرا فون نہیں اٹھا رہا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی میں کیا کروں۔ اسکے گھر پر کال کروں؟"

"میں تے پہلے ای کہیا سی۔ منڈا لارے لا ریا اے۔ اونے ویاہ نئی کرونڑاں۔(میں نے پہلے ہی کہا تھا لڑکا لارے لگا رہا ہے۔ اس نے کوئی شادی نہیں کرنی۔)" اسکے اندر کی بیسٹ فرینڈ جاگ اٹھی جسے لگتا تھا کہ دنیا کا کوئی لڑکا انکی دوست کے ساتھ تب تک مخلص نہیں ہو سکتا جب تک نکاح کے چھوارے نہ بٹ جائیں۔ "تم اس نے بھائی کو فون کرو۔" کافی میکر سے کافی کا کپ بھرتے ہوئے مشورہ چپکایا۔

"وہ کیا سوچے گا میں مری جا رہی ہوں۔ اور اگر اس نے شاہ ویر کو بتایا تو شاید وہ بُرا مان جائے۔"

"لو، یہاں سانس حلق میں اٹکا ہے اور تم اپنے ناں ہونے والے دیور کے تیوروں کو رو رہی ہو۔" دبلی پتلی جسامت اور چھوٹے کٹے بالوں والی ہانیہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"تم نے کبھی محبت کی ہوتی تب میں تم سے پوچھتی۔" آراہ نے گلو گیر انداز میں کہتے چہرہ میز پر ٹکا دیا۔

"ہاں میں محبت کرلوں تاکہ جس رسی میں تم نے لٹکنا ہے اس میں اگلی باری میری آئے۔ میں بتا رہی ہوں یہ محبت نرا چونچلا ہے۔یہودی سازش ہے۔اور۔۔۔۔۔۔" کافی کی دھار اور ہانیہ کی زبان نامی تلوار دونوں ایک ساتھ رک گئے جب اس نے آراہ کو اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے دیکھا۔وہ کپ وہیں رکھ کر تیزی سے اسکی طرف آئی۔ چہرے کی رنگت فوراً بدل گئی۔

"آراہ یار رو کیوں رہی ہو؟" اسکے قریب کھڑے ہو کر اسکی پشت سہلائی۔ انارا مزید تیزی سے رونے لگی۔ کافی بینز کی خوشبو اب اسے زہر لگ رہی تھی۔ اسے ساری دنیا ہی زہر لگنے لگی۔ "یار میں بس ویسے ہی کہہ رہی تھی ہر لڑکا بغیرت نہیں ہوتا، سچ کہہ رہی ہوں تمہارا والا نہیں بھاگے گا تم۔۔۔۔۔"

آراہ روتے روتے ہنس پڑی۔ ہانیہ تسلی دینے میں بری تھی۔ حد سے زیادہ بری۔

"سچ کہہ رہی ہوں شاہ ویر باقی لڑکوں سے مختلف ہے۔"

"رہنے دو تم۔ میرا دماغ ہی خراب کرتی ہو اور اپنا بھی۔ میں کوئی مری نہیں جا رہی۔ نہیں اٹھاتا تو نہ اٹھائے کالز۔ میری طرف سے بھاڑ میں جائے۔" اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ پھولے پھولے گال سرخ ہو رہے تھے۔

"ہاں چھوڑو دفع کرو میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھا ای ضارم بہتر۔۔۔۔"

"پلیز یار۔۔۔۔۔۔" آراہ چڑ گئی۔ "شاہ ویر ویسے ہی اس سے اتنا جلتا ہے۔ اوپر سے وہ یہاں میرے ساتھ کام کرے اور پھر سونے پر سہاگہ تمہاری تعریفیں۔"

"اچھا اچھا آئی ایم سوری۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں ہاتھ اٹھا لیے۔ آج اسکا ہر مشورہ، ہر کام ہی غلط ہو رہا تھا۔ اسے کچھ نیا سیکھنا ہو گا۔ "تمھارے لیے ایک سرپرائز ہے میرے پاس۔"

آراہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کافی میکر تک جانے لگی لیکن ہانیہ اسے کہنی سے پکڑ چکی تھی۔ آنکھوں میں کچھ تھا، کوئی تنبیہہ سی۔ وہ الرٹ ہوئی۔ لب بے اختیار مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔ اسکا بس نہیں چلتا تھا کہ جوش سے کودنے لگے۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سرپرائز کیا ہو گا۔

"ڈونٹ ٹیل می تم وہ لے آئی ہو؟"

ہانیہ نے فخریہ انداز میں نادیدہ کالر چڑھائے۔ اور آگے بڑھ کر کچن کا دروازہ ہلکا سا بند کیا۔ اسی لمحے باہر سے کوئی چلتا ہوا آیا مگر دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ آراہ پر جوش سی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم ملائے بڑی مشکل سے اپنی چیخوں کا گلا گھونٹے کھڑی تھی جب ہانیہ نے بیگ سے کچھ برامد کیا۔ نیم وا دروازے کی درز سے جھانکتی گہری نیلی آنکھیں بھی بیگ سے نکلتا وہ پرزہ دیکھ سکتی تھیں۔

"اومائی گاڈ۔" جوش سے اسکی آواز بدل گئی۔

پرس سے نکلنے والی شے ایک پسٹل تھی۔ سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی پستول ۔ آراہ نے جس مہارت سے اسے ہاتھوں میں لیا، جس انداز سے اسے انگلیوں کے درمیان گھمایا یہ وہ انداز تھا جو نہاں تھا، پھر اب تلک کہانی سے اوجھل کیوں؟ وہ چمکتی آنکھوں سے اس پسٹل کو دیکھتے ہوئے اسے مختلف اندازوں میں گھما رہی تھی۔ پھر اس نے پسٹل آنکھ کے قریب کی اور کافی میکر کا نشانہ لیا۔ اسکے ہر ہر انداز میں ایک عجیب سی خوشی، دیوانگی، اور آنکھوں میں والہانہ چمک تھی۔

"اسکے کاغذات بھی بن جائیں گے اور پتا ہے یہ پسٹل کتنی مشکل سے منگوایا ہے؟ لاہور کے چور بازار سے ملا ہے جب ہی تو اتنا سستا ہے۔ چاچو نے لا کر دیا۔" آراہ نے اس سے بے نیاز چائے کے کپ کا نشانہ لیا اسکی انگلیوں میں ٹرگر دبانے کے لیے بے قراری بڑھ رہی تھی۔ مگر یہاں ٹرگر دبانے کا مطلب تھا خود پر ایف آئی آر کٹوانا۔

”یہ چھٹی بار ہے آراہ، کیوں اپنی دولت اس موئے شوق پر نچھاور کر رہی ہو۔ کہیں اس شاہ ویر کو پھڑکانے کا ارادہ تو نہیں؟“

آراہ ایڑھیوں کے بل گھومی اور اب کے اسکا نشانہ ہانیہ کا ماتھا تھا۔ کوئی اندھا بھی اس مہارت کو دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ اگر وہ گولی چلائے گی تو سامنے والے کی سانس بس آخری بار ہی باہر آئے گی۔ ہاں البتہ دفتر کا کچن اس شوٹنگ کے لیے مناسب جگہ نہیں تھی۔

”آج کل نظر انداز کر رہا ہے مجھے کیا خیال ہے پھڑکا دوں؟“

”میں مدد کروں؟“

درز دراڑ بنی اور دراڑ ایک شگاف، پھر دروازہ ایک دھاڑ سے کھلا۔ جہاں ہانیہ کی جان حلق میں اٹکی وہیں انارا طارون پستول کو اسی طرح ہانیہ کے سر پہ تانے کھڑی تھی۔ نوارد دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ بازو سینے پر باندھے پر شوق نظروں سے یہ مظاہرہ دیکھتا ہوا۔

اونچا قد، پر کشش نقوش، نیلی آنکھیں اور باوقار لباس۔

آراہ نے پستول نیچے کی اور چہرہ اسکی طرف موڑا۔ وہ بے حد سنجیدگی سے آراہ کو تک رہا تھا یوں جیسے اگر وہ کہہ دے تو یہ شخص ابھی کے ابھی شاہ ویر بنگش کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ خالص حوصلہ، خالص جذبہ۔

”امید ہے تم باس کے سامنے اپنا منہ بند رکھو گے، ضارم خان۔“ انارا نے پستول اپنے پرس میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ چہرے پر ایک عجیب سی تلخی تھی۔ عورت ”چاہی“ جائے تو مغرور ہو جاتی ہے۔ وہ بھی ہو رہی تھی۔ یا شاید ہو چکی تھی۔

ضارم نے اپنے چہرے پر گویا زپ چڑھائی ہو۔

"میں اس غیر قانونی اسلحے کی غیر قانونی ترسیل پر اپنا منہ بند رکھوں گا، مس طارون۔"

کافی بینز کے ساتھ کوئی سازش کی بُو بھی بھر گئی۔ پھر رفتہ رفتہ پر سراریت نے بھی یہیں کا رخ کیا اس سے قبل کہ یہ

سب مل کر انارا کا گلا گھونٹتے وہ بیگ کندھے پر لٹکاتی، اپنے ایک ہاتھ میں ہانیہ کا ہاتھ پکڑتی ضارم کے سامنے سے گزر کر باہر نکل گئی۔

اسکا جانا، ضارم کا آ جانا، کافی کا بھرے ہوئے رہ جانا........ اونہوں سوال یہ نہیں تھے۔ بیگ میں بھرا وہ بھاری لوہا۔ اسکی موجودگی سوال تھی اور انارا طارون کی موجودگی پہلی بار مشکوک۔

★★★★★★★★★★★★★★★★★

نیویارک!

پاکستان میں جس وقت شام کے سات بج رہے تھے وہیں نیویارک میں اس سمے صبح کے پانچ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔نیو یارک کے ایک علاقے منہٹن میں لوگ صبح صبح ورزش کے لیے بیدار ہوئے تھے۔ کچھ امراء کی بگڑی اولادیں ساری رات کی پارٹی کے بعد اب نشے کی زیادتی سے جھومتے، لڑکھڑاتے ہاتھ میں کوئی بوتل یا خود کسی کا ہاتھ پکڑے گھروں کو آ رہے تھے۔ منہٹن ابھی مکمل بیدار نہیں ہوا تھا۔

سفید رنگ کے ٹریک سوٹ میں ملبوس کانوں پر بڑے بڑے ہیڈ فونز چڑھائے وہ مختلف گلیوں میں بھاگتا ہوا

نظر آ رہا تھا۔اندھیرا ابھی چھٹا نہیں تھا،ایسے میں سفید ٹریک سوٹ والا شخص کسی کہانی کے منظر کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔سماعتوں میں بجتے انگریزی گانے سے یکسر بے نیاز وہ کل رات کے واقعے کو سوچ رہا تھا۔ مستقبل یکدم ہر مصنوعی و قدرتی روشنی سے زیادہ روشن نظر آ رہا تھا۔کامیابی کے سب سے اونچے زینے پر موجود وہ آج بھی زوال کے خوف سے خوفزدہ تھا۔

منہٹن کی عمارات کہیں غائب ہوئیں اور انکی جگہ شاہ ویر بنگش کے لیے مختص اس سویٹ نے لے لی جو اسے پروڈکشن ہاؤس کی طرف سے ملا تھا۔

"شاہ ویر تم یہ کام پہلے بھی کرتے رہے ہو تمھارے کیریئر میں چھ فلمیں آتی ہیں جنکی cinematography تم کر چکے ہو۔اب اتنا سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟"

سویٹ کے اندر بنے ایک چھوٹے سے ملاقاتی کمرے میں اس وقت رابرٹ کی آواز گونج رہی تھی۔سیاہ چمڑے کے دوصوفوں کے درمیان رکھی میز کے شیشے میں شاہ ویر کا عکس بن رہا تھا۔جو کہ مضطرب تھا۔ہر دفع کی طرح۔

"یہ فلم ایک سیکوئیل ہےاور تم جانتے ہو ناں پچھلی فلم سے کتنی کمائی ہوئی ہے؟یہ ایک سنہری موقع ہےتم ساری دنیا میں جانے جاؤ گےمجھے نہیں لگتا اس پر سوچنے کی ضرورت ہے۔"رابرٹ امریکی تھا اور ہر دوسرے امریکی کی طرح اسے لگتا تھا کہ" ایشینز"کو کوئی بھی آفر دینا"احسان"کے زمرے میں آتا ہے۔

"اگر یہ کوئی عام فلم ہوتی تو میں واقعی سوچنے کے لیے ایک لمحہ نہیں لگاتا لیکن ۔۔۔۔۔"وہ ایک لمحے کے لیے رکاانگوٹھےسے کنپٹی کھجائی۔ہلکی بڑھی داڑھی پرہاتھ پھیرا۔"یہ ڈارک رومانس ہے۔"اس نے بوجھل انداز میں کہا۔"میرے معاشرے میں اسے بُرا سمجھا جاتا ہےمیں خود بھی اسے برا سمجھتاہوں۔۔ "

سیاہ سوٹ والےامریکن نےاچھنبے سے اسے دیکھا۔ایسے جیسے یقین نہ کر پا رہا ہو۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ کوئی اس آفر کو اس وجہ سے ٹھکرا رہا ہے کیونکہ اسکے "کلچر "میں اسے برا سمجھاجاتا ہے۔"وہ واقعی بے یقین تھا۔"شاید تم نے ابھی تک میری طرف سے ہونے والی رقم کی ادائیگی کی آفر نہیں سنی اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔"انگریزوں کا دوسرا پینترا،بات سہانے خوابوں سے نہ

بن سکے تو پیسہ بڑھا دو۔"تم نے پچھلے دو سالوں میں جتنی فلموں کے لیے کام کیا ہے میں اس سے دگنا دے سکتا ہوں۔"

شاہ ویر کے گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔کسی کو خود سے مایوس کرنا وہ آخری کام ہو گا جو وہ کبھی کر سکتا ہو گا۔لوگوں کوناں کرنا کتنا مشکل تھا کوئی اس سے پوچھے۔

"پیسہ شاہ ویر کو خرید نہیں سکتا،رابرٹ۔"اس نے تحمل سے کہا۔دل ہی دل خود کو ڈپٹا بھی۔

"تم سال کا آدھا حصہ یہاں اس ملک میں گزارتے ہو اور تمھیں نہیں لگتا کہ یہ کلچر بھی تمہارا حصہ ہے؟"

"ڈارک رومانس کوئی کلچر نہیں ہے۔یہاں بعض دفع assault کوجسٹفائی کیا جاتا ہے۔زیادتی کو رومانس کہا جاتا ہے اور جنسی تعلقات کو ایک فینٹسی دکھایا جاتا ہے میرا نہیں خیال یہ کسی بھی قوم کا کلچر ہے اور اگر ایسا ہے تو میں اس کلچر سے باغی ہوں۔"

ہاں ٹھیک ہے اس سے منع نہیں کیا جاتا تھا،اسے لوگوں کی ناراضگی کا خوف تھالیکنغلط کو غلط تو وہ ڈنکے کی چوٹ پر بھی کہے گا۔رابرٹ کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے کھڑا ہوا۔اسکے تاثرات یکسر تبدیل ہو چکے تھے اب وہ شاہ ویر کو ایک سطحی ایشین سمجھ رہا تھا۔دور کہیں شاہ ویر جانتا تھا یہ"سمجھ"صرف اس ایک انسان تک نہیں رہے گی رابرٹ آدھی انڈسٹری میں جھوٹ اور سچ کی آمیزش کے ساتھ یہ بات اچھالے گا لیکن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔پاکستان میں لوگ اسکے بارے میں کیا سوچیں گے،وہ ڈارک رومانس کو کیا سمجھتا ہے یہ بات زیادہ اہم تھی۔وہ خود اس بات کو کیا سمجھتا ہے یہ بھی اہم تھا۔

"میں چاہوں گاتم اپنی فیملی یا دوستوں سے مشورہ کر لو بچے۔میری آفر اگلے دو ماہ تک موجود رہے گی۔"

”میں چھبیس سال کا ہوں رابرٹ،اپنے فیصلوں میں آزاد۔جس شے کو میں آج انکار کر رہا ہوں پچیس دن بعد بھی وہی کروں گا۔میں اپنی فیملی کو بتاتا ہوں کہ میں یہ کر رہا ہوں ان سے پوچھتا نہیں۔“

وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔گردن اٹھی رہی،اور لب ہلکی سی مسکراہٹ میں ڈھلے

ہوئے۔)بھاڑ میں گیا ادب گورے کو تمیز نہیں توشاہ ویر بھی بدتمیزی میں تمغہ حاصل کر سکتا تھا(رابرٹ نے سر کو ہلکا سا خم دیا اور پلٹ گیا۔جاتے جاتے زیر لب انگریزی میں کوئی گالی بھی دی تھی۔اسکے جانے کے بعد شاہ ویر کتنے ہی لمحے اضطراب میں مبتلا رہا۔وہ یہاں اس صوفے پر بیٹھ کر بغیر کسی ٹائم مشین کے اپنا مستقبل دیکھ سکتا تھا،مسائل اسے آج سے مسائل کا سامنا کرنا تھا یہ وہ جانتا تھا۔امریکا میں بیٹھ کر اگر کیریئر بنانا تھا تو گوروں کو ”جی جی“ کہنا تھا۔اور ضمیر والا تو یہ کہنے سے رہا۔

منظر ٹوٹ گیا تو وہ گلی کے بیچوں بیچ ٹھہر گیا۔سانس دھونکنی کی مانند پھولا ہوا تھا۔سفید رنگت میں سرخیاں گھل رہی تھیں۔اسکا موبائل بج رہا تھا۔جیب سے موبائل نکال کر اس نے پیغامات کی فہرست کو نظر انداز کرتے ہوئے مطلوبہ چیٹ کھولی اور واٹس ایپ اسے چودہ نئے پیغامات کی نوید سنا رہا تھا۔آخری پیغام میں کوئی دھمکی تھی۔

”اب اگر تم نے میرے میسج کا جواب نہیں دیا تو خدا کی قسم میں تمھیں بلاک کر دوں گی۔“آراہ کا بس ایک پیغام ہی اسکے سارے وجود میں بے چینی گھول گیا۔اس نے جوابی پیغام ریکارڈ کرنا چاہا مگر وہ ٹھہر گیا۔کوئی اسکے عین سامنے آ کر رکا تھا۔ملگجے اندھیرے میں ابھی شاہ ویر اسکی طرف دیکھتا کہ ۔۔۔۔۔اس آدمی نے شاہ ویر کو گریبان سے کھینچ کر اپنے قریب کیا اور ہاتھ میں پکڑے چاقو سے پے درپے اسکی پسلیوں کے درمیان وار کیا۔وہ چیخا،کراہا،موت کو اپنے بے حد قریب دیکھا۔مگر یہ وار اتنا تیز اور برق رفتار تھا کہ جیسے آتی جاتی سانس۔

"کہیں تم میری موجودگی بھولے تو نہیں، پرنس چارمنگ؟" چاقو کا لوہا اسکی پسلیوں میں گھماتے ہوئے اس نے ایسے ٹھنڈے انداز میں پوچھا کہ شاہ ویر سانس نہیں لے سکا۔وہ متحیر سا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے کھڑے آدمی کو دیکھ رہا تھا۔یہاں تک کہ اسکے پورے جسم میں درد کی ایک لہر اٹھی۔اسکے سامنے کھڑا آدمی اب بھی سرد نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔شاہ ویر کا ہاتھ بے اختیار اپنی پسلیوں تک گیا، پھر اس نے وہی ہاتھ آنکھوں کے آگے کیا۔سرخ،لال، قرمزی۔خون بس خون۔اسے سمجھ نہ آیا لمحوں کے اندر اندر ہوا کیا۔

درد اتنا شدید ہوا کہ وہ گھٹنوں کے بل سڑک پر گر گیا۔کتنے ہی لمحے وہ گردن جھکائے،سانس روکے متحیر اور شل سا اپنے بہتے خون اور سفید سے سرخ ہوتے ٹریک سوٹ کو دیکھتا رہا۔

۔"کون ہو تم؟کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"پسلیوں پر ہاتھ رکھے،درد بمشکل سہتے اس نے نگاہیں اٹھاکر سوال کیا۔سیاہ لباس والے آدمی نے اسکے سینے پر بھاری بوٹ سے ٹھوکر مار کر اسے گرایا، مگر شاہ ویر نے برق رفتاری سے اسکا بوٹ پکڑ کر اسکی ٹانگ کو گھمایا،توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے وہ گرا۔شاہ ویر نے اسکے منہ پر چڑھا مفلر ہٹانا چاہا مگر سامنے والے نے جمی ہوئی مٹھی کا ایک مکا اسکے جبڑے پر دے مارا،شاہ ویر تیورا کر سڑک پر گرا۔درد جیسے ہی دو منٹ کی عمر سے گزرا اس نے ایسی شدت پکڑی کی شاہ ویر بنگش کی روح قبض ہونے لگی۔وہ حلق کے بل چیخا۔

پسلیوں سے خون بھل بھل بہہ رہا تھا۔آنکھوں کے آگے منظر دھندلے پڑ رہے تھے اور جسم سے جیسے روح قبض ہو رہی ہو۔مگر۔۔۔۔۔۔اس نے اٹھنے کی سعی کی اور اسکے چہرے پر ایک اور ضرب پڑی۔شاہ ویر بے اختیار بلند آواز میں کراہا۔اسے کوئی گالی بھی دی۔

وہ دونوں گلی کی ایسی جگہ تھے جہاں اونچی عمارت کے عقب میں کوئی انکو دیکھ نہیں سکا۔

"تم ۔۔۔۔۔کون . . . . . . ہو ؟کیا . ۔۔۔۔۔چاہتے ہو ؟"وہ سرمئی سڑک پر گرا ہوا تھا۔اسے گھائل کرنے والا اسکے سر پر کھڑا تھا اور وہ ہار نہیں مان رہا تھا۔سیاہ جینز کے اوپر سیاہ شرٹ اور اوپر فر والا جیکٹ پہنے اس نے چہرے پر کوئی کپڑا باندھ رکھا تھا۔سیاہ آنکھوں میں کوئی سرد و تاریک تاثر تھا۔

"کون ہو تم؟ چاہتے کیا ہو؟"

سیاہ لباس والا آدمی اپنا چہرہ اسکے چہرے کے قریب لایا۔اسکی سیاہ آنکھوں میں تنفر تھا، سرد مہری تھی۔

میں تمہاری موت ہوں، تمہارا خوف، تمہارا "درد، زندگی کے بقیہ چند ماہ میں اگر تم کسی کو یاد کرو گے تو وہ میں ہوں۔تمہارا سب سے عزیز۔تمہارا واحد ساتھی۔"

شاہ ویر چند لمحے اسے تکتا رہا۔اسکے جسم میں کوئی جنبش نہیں ہو رہی تھی۔دھیرے دھیرے درد سینے تک آ رہا تھا۔آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔چہرے اور سینے پر لگنے والے بوٹ سے جلن بڑھ رہی تھی۔مگر اس نے گردن اٹھائی، چند لمحے مزید اسے دیکھا اور پھر شاہ ویر طلال بنگش نے اس کے منہ پر تھوکا۔۔۔۔۔۔۔۔

"تمھارے خوف کی میرے آگے یہ اوقات ہے۔"

سامنے والا ساکت رہ گیا۔

اگی کئی ساعتیں منہٹن کی اس گلی میں شاہ ویر بنگش کے اونچے اونچے قہقہے گونجتے رہے۔وہ گردن دائیں سے بائیں ہلاتے تکلیف اور ایک عجیب سے احساس کے تحت حلق کے بل قہقہے لگا رہا تھا۔ایسے جیسے وہ ہارا نہیں، یا پھر ایسے جیسے وہ خود کو فاتح سمجھتا ہو۔یا ایسے جیسے وہ کوئی ذہنی مریض ہو۔

چند لمحے وہ نقاب پوش بے حد ٹھنڈی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔اسکی سیاہ آنکھوں میں جیسے خون کے شعلے لپکنے لگے ہوں۔شاہ ویر اب بھی ہنس رہا تھا۔آنسو آنکھوں سے نکل نکل کر کنپٹی میں جذب ہو رہے تھے۔درد سے اسکی جان جا رہی تھی مگر وہ ہار نہیں مان رہا تھا۔وہ محض سامنے والے کو چڑا رہا تھا۔

"تم سے کھیل کر مزہ آئے گا۔"

وہ بغیر کسی وار کے اسی سفاکیت سے بولا اور چند لمحے مزید اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے بھورا بوٹ پوری قوت سے شاہ ویر کے جبڑے دے مارا۔ ہنسی تھم گئی، کراہیں اور چیخیں بلند ہوئیں۔ اگلا بوٹ اسکی پسلیوں کے درمیان پڑا۔ وہ اور اونچا چیخا۔

قرمزی سیال سڑک کو تر کر رہا تھا اور شاہ ویر دھندلاتی بصارت سے بس یہ سوچ رہا تھا کیا یہ انت ہے؟ ماتھے پر سیاہ

پٹی باندھے، ہاتھوں میں سیاہ جھنڈا اٹھائے وہ میر کارواں ہر ناانصافی کے لیے سڑک پر نکل آتا تھا اور آج جب کوئی اسکی پسلیوں کے قریب گوشت میں خنجر مار گیا تھا تب کیا کوئی اس کے لیے نہیں آنے والا تھا؟

شاید نہیں۔ کبھی نہیں۔

★★★★★★★★★★★★★

مری کی ٹھنڈ کا وہی عالم تھا۔ برف باری جوں کی توں۔ پولیس سٹیشن میں عجب ہنگامہ آرائی کا سماں تھا۔ وردی میں ملبوس پولیس افسران چائے کے دور چلا رہے تھے۔ سہراب یمن کا تبادلہ دو سال قبل ایک پیچیدہ اور ہائی پروفائل قتل کیس کی کامیابی کے بعد مری ہوا تھا۔ اور ان دو سالوں میں لاہور کو خیر آباد کہہ کر اس نے اپنا ڈیرہ یہیں بسا لیا تھا۔ لیکن اب۔۔۔اب اسے واپس لاہور جانا تھا۔ وہ اس سرد شہر میں تنگ آ رہا تھا اور آج کل اپنے تبادلے کی کوششوں میں سرگرداں تھا۔

"لاہور پولیس کے اسپیشل کرائم برانچ سے مری کے اس سڑے ہوئے تھانے تک کا سفر کیسا رہا؟"

تھانے کے احاطے میں ایک مکمل دفتر کی بجائے محض دو میزوں اور تین کرسیوں پر مشتمل سہراب یمن کی جاگیر میں تھانے دار صاحب نے قدم رکھتے ہوئے زہر بھی اگلا۔ سہراب نے ایک نظر اسے دیکھا پھر سر جھکا کر

دوبارہ اپنے سامنے پھیلے کاغذات کے پلندے دیکھنے لگا۔ موبائل پر واٹس ایپ کھلا تھا جہاں وہ "وائف" نامی کسی رابطے کو مسلسل پیغام بھیج رہا تھا۔ جواب ندارد دو بجے عدالت بھی جانا تھا۔ وہ مکمل طور پر مصروف تھا۔

"سنا ہے تم تبادلے کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہے ہو۔ کیا ہوا کام ہو نہیں رہا؟"

"سرکاری کاموں میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔" مصروفیت سے جواب دیا۔

"یار تم نے مجھ سے کہا ہوتا۔" ایس ایچ او نعیم آگے آیا۔ سہراب کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ "مجھ سے بات ہی نہیں کی۔"

"آپ لاہور پولیس میں ڈی آئی جی لگے ہیں؟" سہراب نے اسی جھکی ہوئی گردن سے جواب دیا۔ اپنی زبان ایسی تھی پھر بد تمیز پوچھتا تھا اسلان یمن کی زبان کیوں تیز ہے۔

"پاکستان میں اپنا کام نکلوانے کے لیے عہدہ چاہیے ہوتا ہے۔" اس نے اضافہ کیا۔

"صحیح کہا تم نے۔ لیکن اس ملک میں ایک عہدیدار آدھے خاندان کے کالے چٹھوں کا امین ہوتا ہے میرے سسر لاہور پولیس میں ڈی آئی جی ہیں۔" وہ فخر سے کہہ رہا تھا۔ ساتھ سہراب کی میز پر رکھے تھرماس سے ایک کپ میں اپنے لیے چائے نکالی۔

سہراب جانتا تھا۔ (اگر اسکے ماموں یعنی سسر کی اتنی چلتی ہوتی تو خود آج مری کی برف میں سفید گولہ نہ بن رہا ہوتا)

"تم کہو تو میں بات کروں تمھارے لیے؟"

اس نے کاغذات پرے دھکیلے کہ یہ ڈھیٹ یہاں سے ٹلنے والا تو تھا نہیں۔ بھوری سنجیدہ نگاہیں اٹھا کر سامنے بیٹھے آدمی کو دیکھا۔

"بدلے میں مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

نعیم مسکرایا۔ "تمہاری ذہانت کا میں مداح ہوں۔" وہ آگے کو ہوئے۔ "پہلی بات۔۔۔۔یہ جو باہر آدمی آیا بیٹھا ہے ناں۔۔۔۔۔۔۔۔۔" اس نے ہاتھ اونچا کر کے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ڈیڑھ ہفتے سے یہیں آرہا ہے اس کے گھر سے پندرہ لاکھ نقدی اور پندرہ تولہ سونا چوری ہوا ہے۔ایک ہفتے سے ہر جگہ ڈھونڈ لیا لیکن کچھ مل نہیں رہا۔سال کے اختتام پر میری رپورٹ اوپر جائے گی اور اسی کی بناپہ میرا تبادلہ ہونا ہے اگر تم اسے سنبھال لو تو۔۔۔۔۔"

"ڈی آئی جی لاہور آپ کا کام نہیں کر سکتے کیا؟"

"عجیب خبطی اور اصول پسند آدمی ہے وہ۔" نعیم نے منہ بنایا۔ "تمہارے تبادلے کے لیے پھر بھی مان جائے گا کیونکہ تم قابل ہو۔"

اگر اس تعریف کا اس پر کوئی اثر ہونا تھا تو نہیں ہوا۔وہ اب تک اسے انہی سابقہ "سوالیہ" نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔البتہ وہ سمجھ گیا تھا سسر صاحب رشتے داری سے زیادہ قابلیت پر کھتے ہیں۔

"دوسرا کام؟"

اب کے نعیم ٹھہر گیا۔انداز میں ایک محتاط سا تاثر آیا اور اس نے گردن گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔

"اصل میں میری بیٹی کے رشتے دیکھ رہا ہوں میں۔" وہ رکے سہراب کو جاننا اور اسکے ساتھ کام کرنا الگ بات تھی یہ الگ بات۔ "وہ تمہارا بھتیجا، سنا ہے وہ۔۔۔۔۔۔دراصل وہ میری بیٹی کا ہم عمر ہے اور سلجھا ہوا۔۔۔۔۔"

"ناہنجار ہے وہ اپنی بیٹی کے لیے اگر اسکا سوچ رہے ہیں تو بہت غلط ہے۔" انکی بات پوری ہونے سے قبل ہی سہراب نے انہیں ٹوک دیا۔ نعیم شل ہی تو رہ گئے۔ مسکراہٹ پھیکی پڑی۔

"میں نے سوچا تمہارا بھتیجا ہے اسکی تربیت اچھی ہی ہو گی۔اور وہ قابل بھی۔۔۔۔"

"بالکل میرا بھتیجا ہے اور بہت قابل بھی رہا ہے۔لیکن فلحال وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسکے ساتھ کسی کی زندگی جوڑی جائے۔"سہراب کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا۔"میں یہ والا معاملہ دیکھ لوں گا لیکن آپ کے دوسرے کام میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔میری بھی ایک بھتیجی ہے کسی اور کی اولاد کے ساتھ برا نہیں کر سکتا۔"

نعیم چند لمحے بالکل خاموش رہ گیا۔اسلان یمن کے لیے سنے ہوئے کئی مفروضے ذہن کے کواڑوں پر بھاری دستکیں دینے لگے،اس لڑکے کی سپاٹ آنکھیں بے اختیار عجیب سی نظر آئیں۔وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور سہراب کے برابر آ کر کھڑے ہوئے۔

"کیا یہ سب۔۔۔۔یعنی چار سال پہلے جو ہوا۔۔۔۔"انہوں نے آس پاس دیکھا پھر آواز سرگوشی کی مانند دھیمی کر لی۔"کیا یہ سچ ہے کہ پنار سکندر کا اغوا اور قتل اسلان نے کیا تھا؟"

قتل کوئی نیا لفظ نہیں تھا مگر سہراب ایک پل کے لیے جامد ہوا تھا۔اگلے لمحے جمود ٹوٹا اور اسکی جگہ کسی لاوے نے لیتے ہوئے اسکا سارا بدن جلانا شروع کیا مگر جب وہ بولا تو بے حد ٹھہرے ہوئے اور مستحکم لہجے میں بولا۔

"سہراب یمن غیب کا علم نہیں رکھتا۔"وہ رکا۔"اور اس لڑکی کی لاش آج تک نہیں ملی۔اسے قتل نہیں کہا جا سکتا۔"

اپنی میز سے دوسری میز تک جاتے ہوئے اسے کئی کلو کی بھاری زنجیریں جیسے پیروں کے ساتھ گھسیٹنی پڑ رہی ہوں۔اسلان کے لیے اسکا دل جلتا تھا۔

"آپ کا لڑکا ہر وقت کسی سوچ میں رہتا ہے۔"

"اسے ڈاکٹر کو دکھائیں،بال نہ دینے پر میرے بچے کو پاگلوں کی طرح مارا ہے اس نے۔"

"میرا خیال ہے اس پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے، کمبخت ہے بھی تو خوبرو"

"ہو نہ ہو اس لڑکی کے اغواء میں اسکا کوئی نہ کوئی تعلق تو ہے۔"

پندرہ قدموں کا فاصلہ پندرہ صدیوں پر محیط لگا۔ ہر مفروضہ، ہر ممکنہ توجیہہ سر سے جھٹکتا وہ میز کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھا۔ ٹانگ پر چڑھائی اور اپنے سامنے بیٹھے باریش بوڑھے کو دیکھا۔

"آپ کے بیان کے مطابق پندرہ لاکھ کیش اور بیس تولہ سونا آپ کے گھر سے غائب ہے درست؟"

بوڑھے نے مڑ کر اسے دیکھا اور جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

"تجوری کا پاس کوڈ آپ کے علاوہ کس کو پتہ تھا؟"

"میری بڑی بہو اور بڑے بیٹے کو لیکن میرا بیٹا اس وقت شہر سے باہر تھا۔"

"ٹھیک۔" اس نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔ ساتھ ساتھ وہ رپورٹ کو پڑھتا بھی رہا جس میں بوڑھے کا پتا، نام اور کام لکھا تھا۔ سہراب نے اس پرچے سے بس تین لفظ اپنے ذہن میں بٹھائے۔

"بہو، ذات سید، پیشہ اسلامیہ کالج لیکچرر۔"

"دیکھیں جناب بات کچھ یوں ہے کہ پولیس کو اپنی ساری تفتیش کے دوران اگر کوئی مشکوک لگا ہے تو وہ آپ کی بڑی بہو ہیں۔"

بوڑھے آدمی کے چہرے سے گویا کسی نے سارا خون نچوڑ لیا اور اگر کچھ پیچھے بچا تو وہ سفید ماس تھا۔ سہراب بے نیازی سے کہہ رہا تھا۔ "اس لئے ہمیں یہ کرنا ہو گا کہ آپ کی بڑی بہو کو تھانے لا کر تفتیش کرنی ہو گی۔"

۔"ہماری عورتیں بلاضرورت گھروں سے باہر نہیں نکلتیں۔" بوڑھے کا چہرہ سرخ ہوا۔

"یہ بھی تو گھر کی ضرورت کا معاملہ ہے چچا۔ فکر نہ کریں پردے کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا ہاں بس محلے والوں کی نظروں کی ذمہ داری میں نہیں لیتا۔" وہ کس دیدہ دلیری سے، کیسے اپنے علم و فن کو استعمال کرتے ہوئے سامنے والے کو عاجز و بے بس کر رہا تھا یہ ہر کوئی دیکھ سکتا تھا۔ سارا تھانہ چائے کے کپ اور بسکٹ کی پرچ لیے آس پاس جمع ہو گیا۔ "لیکن محلے کا کیا ہے پیسہ اور زیور بہت قیمتی ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک طرف دیوار میں ٹنگی ہتھکڑی اٹھائی، میز پر پڑا پولیس کا ڈنڈا اٹھایا اور ایک ہانک لگائی۔

"اجمل پولیس موبائل تیار کرواؤ اور لیڈی کانسٹیبل گاڑی میں بٹھاؤ۔ شاہ صاحب کی بڑی بہو کو تفتیش۔۔۔۔۔"

"میں ایف آئی آر واپس لیتا ہوں۔" بوڑھا تڑپ کر بولا۔ "میرا معاملہ، میرا پیسہ سب اللہ کے حوالے مجھے پولیس سے کچھ نہیں چاہیے لیکن میری بہو تھانے نہیں آئے گی۔" وہ دلگیری اور قطعیت سے کہہ رہے تھے۔

سہراب نے سادگی سے انہیں تکا۔

"سوچ لیں شاہ صاحب پندرہ لاکھ نقدی اور سونا کوئی کم رقم نہیں۔ اسکے علاوہ اگر آپ نے اعلیٰ حکام سے کوئی شکایت کی تو میں یہ کہتے ہوئے بالکل نہیں ہچکچاؤں گا کہ آپ کی بہو اس تخریب کاری میں معاونت کار تھیں۔"

بوڑھے نے بغیر کچھ کہے بس ایک لمحے کو نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور سہراب کو یوں لگا جیسے ان نگاہوں میں ڈھیر ساری ملامت تھی۔۔۔۔۔ لیکن خیر۔ اسے اب ملامتیں باضمیر نہیں کر سکتیں تھیں۔ ہمیشہ کی طرح وہ مسئلہ حل کر چکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح دامن صاف، گردن کسی قسم کے طوق سے خالی۔ اور ہاتھ بے عیب۔

"اب تو سمجھو تمہارا تبادلہ ہو گیا۔" شاہ صاحب کے جانے کے بعد نعیم نے بے حد والہانہ پن سے کہا تھا۔ "اب

تمھیں مزید اس شہر میں رہنے کا جبر نہیں برداشت کرنا پڑے گا۔" وہ خوش نظر آ رہا تھا۔ سہراب کا چہرہ ہر تاثر سے پاک۔

"اب واپس لاہور۔ تم اپنے گھر جاؤ گے۔"

"آف کورس۔" سہراب یمن نے سر کو ہلکا سا خم دیا۔ ذہنی خرافات کے قصے پھر سہی۔

★★★★★★★★★★★★★

"نیویارک"

اسکی آنکھیں نقاہت سے بند ہو رہی تھیں جب اس نے کسی گاڑی کو اپنے پیروں کے بالکل قریب رکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بہ دقت آنکھیں کھلی رکھنے کی سعی کی لیکن اب یہ کام بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اسے اپنا نچلا دھڑ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا اور اسکا موبائل وہ آخری کال کے بعد اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر وہیں کہیں گر گیا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور کوئی مرد تیزی سے باہر آیا۔

"جوزف . . . . ." شاہ ویر نے دکھتے ہوئے حلق سے بمشکل آواز نکالی۔ اسکا سفید ٹریک سوٹ اس وقت سارے کا سارا سرخ پڑ گیا تھا۔ جوزف اسکے قریب آکر بیٹھا۔ اسکے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"یہ کیا ہوا ہے شاہ ویر؟ یہ کس نے کیا ہے؟ کیا میں پولیس کو کال کروں؟" وہ اپنی جیب سے موبائل نکال رہا تھا۔

شاہ ویر کے ہاتھوں میں اس وقت طاقت نہیں تھی ورنہ رکھ کر ایک طمانچہ اسے مارتا اور کہتا "پولیس والے تو تم بھی ہو گدھے۔" لیکن فلحال اس نے بس تین انگلیوں کے اشارے سے اسے اپنے قریب جھکنے کو کہا۔ سانس لینے میں اب مشکل ہو رہی تھی۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔

"یہ خون صاف کرواؤ، اور ابھی اس وقت مجھے ایک جگہ لے کر جاؤ۔ میں تمھیں ایڈریس بتاتا ہوں۔"

جوزف نے اسے یوں دیکھا جیسے اسکا دماغ چل گیا ہو۔

"تمہارا دماغ خراب ہے اپنی حالت دیکھو یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے۔ میں ابھی اپنی ٹیم کو بلواتا ہوں جس نے بھی حملہ کیا ہے اس نے ضرور کوئی نشان پیچھے چھوڑا ہو گا۔" وہ پریشانی سے کہہ رہا تھا۔ وہ اب تک نا محسوس انداز میں شاہ ویر سے فاصلے پر تھا۔ یک ہاہ گورے اور انکے چونچلے۔ اگر یہاں کوئی پاکستانی ہوتا تو پہلے دوست کو کندھے پر ڈالتا اور پھر اس موئے ادھ قاتل کا پتا ڈھونڈتا۔

"جوزف پلیز میری بات سمجھو۔" اسکی آواز بیٹھی ہوئی تھی کچھ بھی کہنے کی کوشش کرتا تو جیسے سارا جسم اکڑنے لگتا۔ "مجھے ایک ایڈریس پر چھوڑ کر آؤ میں وعدہ کرتا ہوں شام تک تمھیں سب سمجھا دوں گا۔ پولیس کو شامل مت کرو۔"

جوزف لب کاٹنے لگا۔ اسے کہیں بھی لے کر جانا اپنی نوکری سے دغا ہوتی اور کرائم سین کے ثبوت مٹانا دغا کے اوپر ٹھپہ لگانے کے برابر۔ لیکن شاہ ویر بنگش کے احسان اتنے تھے کہ وہ تمام عمر کا گلٹ سہہ سکتا تھا۔ وہ people person تھا۔ لوگ اسکے لیے جان ہتھیلی پر سجا کر رکھتے تھے۔ ساحر تھا وہ سفید کو سیاہ کہے تو تُف ہے ان پر جو انکار کریں۔

اگلے چند پلوں میں اس نے سڑک صاف کر دی تھی، گاڑی کی پچھلی نشست پر شاہ ویر کو بٹھا دیا تھا۔ جو اب بھی موبائل سے کسی کو کال ملاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جوزف نے ڈگی کھول کر خون آلود کپڑے اس میں ڈالے اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھا۔ اگلے چند لمحوں میں اسکی گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ شاہ ویر سیٹ سے ٹیک لگائے گہرے لمبے سانس لے رہے تھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ رنگت نچڑ کر رہ گئی تھی۔

"تم ہسپتال کیوں نہیں جا رہے، شاہ ویر؟"

"دو دن ہفتہ بعد میں ایوارڈ شو میں شرکت کرنے جا رہا ہوں۔ چھ دن بعد میں ایک بہت بڑے بجٹ کی فلم کے لیے

منظر بندی کا معاہدہ دستخط کرنے جارہاہوں،اس ماہ کے آخر میں میری کتاب لانچ ہو رہی ہے تمھیں لگتا ہے اس وقت تمھارے ملک میں شاہ ویر بنگش ایک اسکینڈل افورڈ کر سکتا ہے ؟" وہ نقاہت سے بولا۔

"تم وکٹم کہلاؤ گے یار۔" وہ موڑ کاٹ رہا تھا۔

"مجھے وکٹمز سے نفرت ہے۔ کہانی کی لائم لائٹ غلط وقت پر لے جاتے ہیں۔" شاہ ویر عجیب انداز میں بولا۔

"یہ ہیرو بننے کا وقت نہیں ہے۔"

"میں ایسی کوشش کرتا ہی نہیں۔" اس نے خون سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے موبائل کان سے لگایا۔ کال اٹینڈ ہوگئی تھی۔ "اپنے فلیٹ پر کسی اچھے ڈاکٹر کو بلواؤ پیسے کی فکر مت کرنا بس رازداری شرط ہے۔ تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔ میں پہنچ رہا ہوں۔"

جوزف اسے دیکھ کر رہ گیا۔ کیا یہ وہی آدمی ہے جس کا جسم ادھڑا ہوا ہے،خون جسم سے پانی کی طرح بہہ رہا ہے اور وہ اس وقت اپنے کیریئر اور ذات کو کسی قسم کے دھبے سے بچانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ کیا وہ ذہین تھا؟ یا کوئی ذہنی مریض؟

"اس ایڈریس تک چلو۔" اس نے موبائل کو سینے والی جگہ پر رگڑتے اس پر لگا خون صاف کرتے لوکیشن بتائی۔

چند منٹ پر لگا کر اڑے اور اب وہ ساؤتھ برانکس کے ایک چھوٹے سے گھر میں موجود تھا۔ ساؤتھ برانکس نیو یارک کا قدرے خطرناک اور غیر محفوظ علاقہ ہے۔ جیب کترے، کرائے کے غنڈے اور چھوٹے موٹی چوریوں سے لے کر بڑے بڑے ڈاکے مارنے والے مجرم اسی علاقے میں اپنا بسیرا رکھتے ہیں۔ فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں جہاں امریکا اور نیو یارک کی صرف سیاحتی طرف دکھائی جاتی ہے وہیں ساؤتھ برانکس جیسے علاقے کیمرے کی آنکھ سے اوجھل رکھے جاتے ہیں۔

عمارت کے اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں سیاہ صوفے پر وہ بمشکل کمر سیدھی کیے بیٹھا تھا۔ جوزف اسکی دائیں

طرف بیٹھا منہٹن کی اس گلی کی سی سی ٹی وی فوٹیجز اپنے پاس منگوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرش پر جا بجا خون پھیلا تھا۔ سفید روئی کے سرخ ہو چکے کئی گولے فرش کی زینت بنے ہوئے تھے اور وہ گہرے لمبے سانس لے رہا تھا۔ چہرہ پیلا پھٹک ہو رہا تھا۔ ہونٹ خشک۔

"تم ڈرنک کرتے ہو؟" جامنی بلاؤز اور منی اسکرٹ والی لڑکی انجکشن پر انگلیوں سے "ٹک ٹک" کرتے ہوئے اسے جانچتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ "اگر کرتے ہو تو بتاؤ مجھے نشے کی مقدار بڑھانی پڑے گی۔"

"صرف بیئر پیتا ہوں۔" شاہ ویر گہری سانسوں کے درمیان بولا۔ اسکی معالج کندھے اچکا گئی۔

"دیکھ لیتے ہیں۔" وہ ادھڑا جسم جوڑنے کے کئی سامان لے کر آئی اور اسکے قریب آ کر بیٹھی۔ ہاتھ شاہ ویر کے بازو کی طرف بڑھایا جب اس نے روکا۔ آنکھیں بند سی ہو رہی تھیں۔

"تم مکمل ڈاکٹر ہو؟"

جامنی اسکرٹ والی جینیفر رک گئی۔ اسکے جامنی بال جو ماتھے پر کٹے ہوئے تھے آنکھوں میں گھسنے سے بمشکل بچے ہوئے تھے۔ ہونٹ کثرت سگریٹ نوشی سے سیاہ پڑ رہے تھے۔ اور منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔

"تمھیں کیا لگتا ہے؟"

"اگر تم ڈاکٹر نہیں ہو تو مجھے ہاتھ بھی مت لگانا۔"

جینی نے تمسخر سے سر دائیں بائیں ہلایا اور پھر شاہ ویر کا بازو کھینچ کر اپنی طرف کیا۔ وہ نقاہت کا مارا مرد بس کراہ سکا۔ بازو چھڑوانے کی سعی کی مگر وہ گرفت مضبوط کر گئی۔

"مکمل ڈاکٹر ہوں میں۔ زیادہ پیسہ بنانا چاہتی تھی اس لیے منشیات فروشی کی طرف آ گئی اور۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر پکڑی گئی اور پھر پولیس اور پھر میں معاشرے کے لیے ایک مجرم بن گئی۔ اس لیے اب میں مجرموں کا علاج کرتی

ہوں۔" اس نے سوئی چبھونی چاہی مگر شاہ ویر نے اپنا بازو کھینچ کر اسکی گرفت سے نکالا۔

"بغیر anesthesia کے کام کرو۔" وہ بے لچک انداز میں بولا۔ موبائل پر بات کرتے ہوئے جوزف بری طرح ٹھٹھکا، ایلکس نے اپنی گردن اتنی تیزی سے موڑی کہ گردن چٹخنے کی آواز آئی۔ "مجھے ہوش میں رہنا ہے.

لوکل بھی نہیں؟"لوکل نشہ آور سوئی تب لگائی جاتی ہے جب محض زخم کی جگہ سن کرنی ہو۔"

"لوکل بھی نہیں۔"

وہاں دو لوگ تھے جو اسکے بہترین دوستوں میں سے تھے ایک جو اسے سڑک سے اٹھا کر اپنی ملازمت خطرے میں ڈال کر اسے یہاں لایا تھا دوسرا وہ تھا جس نے اس غیر امن علاقے میں اسکی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی اسے اپنا گھر دیا مگر وہ غنودگی میں چلا جاتا تو یہ تینوں لوگ "انسان" ہوتے اور شاہ ویر بنگش انسانوں پر بھروسہ نہیں کیا کرتا تھا۔ دوست، بھائی، خاندان اسے اپنے معاملے میں کسی پر کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ جینی نے اسکی بات پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باقی اوزار اکھٹا کیے اور گھٹنوں کے بل شاہ ویر کے قدموں کے قریب آکر بیٹھی۔ ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور ایک نظر شاہ ویر کو دیکھا۔ ایسے جیسے پوچھ رہی ہو "تیار ہو؟"

شاہ ویر نے اپنا ہاتھ دانتوں کے درمیان دبایا۔ پسینے سے تر بال ماتھے سے ہٹائے اور تھکتی آنکھوں سے "ہاں" میں جواب دیا۔ اس نے گردن پیچھے صوفے پر ڈھلکا دی۔ آنکھوں سے آنسو نکل کر کنپٹی میں جذب ہو رہے تھے، وہ ساکن سا چھت کو گھور رہا تھا۔ کیا تھا وہ کیا بن رہا تھا؟ لوگ، خوشبو، طاقت، مشہوری، فن وہ کس کس شے کا بادشاہ تھا اور کہاں آکر قسمت اس سے کج ادائی کر رہی تھی؟

اسی پل اسکا موبائل تھرتھرایا۔ مخصوص آواز۔ شاہ ویر تیزی سے سیدھا ہوا۔ اسکی بھیگی تکان زدہ آنکھوں میں کوئی بے اختیاری سی اتری۔ جس سخت خول میں وہ بند تھا وہ چیخ گیا۔ بس ایک کال، صرف ایک نام نے اسے پگھلا دیا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے موبائل اٹھایا۔ کال اٹینڈ کی اور انگلی لبوں پر رکھتے باقیوں کو خاموش رہنے کو

کہا۔اسی لمحے جینی نے پہلا ٹانکا لگایا۔شاہ ویر نے دانتوں پر دانت جما لیے جسم جیسے کسی نے دہکتے ہوئے کوئلے میں ڈال دیا ہو۔

"ہیلو شاہی؟ تم مجھے سن سکتے ہو؟"

"یس.... یس، آراہ بولو۔" درد پر بمشکل قابو پاتے لہجے کی لرزاہٹ کو روکتے اس نے بہ دقت کہا۔جینی بے رحمی سے ٹانکے لگاتی جا رہی تھی۔اسے جیسے کسی بات سے کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا تھا ہاں مگر اس کے انداز میں بلا کی مہارت تھی۔

"تم اتنے دنوں سے مجھے اگنور کر رہے ہو تم آخر ہو کہاں؟" وہ رو پڑی۔"میں نے ماموں اور چاچو سے بات بھی کر لی۔میں نے بھائی سے بات کر لی اور تم نے کہاں آ کر مجھ سے منہ موڑا ہے کیا میں یہ ڈیزرو کرتی ہوں؟"

وہ بری طرح رونے لگی تھی۔شاہ ویر ہنوز ہتھیلی دانتوں میں دبائے ہوئے تھا ہر ٹانکے کے ساتھ اسکی رنگت زرد پڑتی جاتی دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا اور سانس کہیں سینے میں اٹک جاتی۔اس نے گردن پیچھے صوفے پر ڈھلکا دی۔اسے حیرت تھی وہ اب تک بے ہوش کیوں نہیں ہوا؟

"آراہ....." اس نے بے حد تحمل سے اسے پکارا۔ساتھ ہی جینی کو ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔"آئی لو یو ،آئی ریئیلی ڈو۔(میں تم سے محبت کرتا ہوں۔میں واقعی کرتا ہوں) کوئی چچا، ماموں یا بھائی تمھیں مجھ سے الگ نہیں کر سکتا اوکے؟"

دوسری طرف محض اسکے سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔شاہ ویر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔جینی نے گھڑی کو دو انگلیوں سے بجاتے ہوئے اسے اپنا وقت ختم ہونے پر مطلع کیا۔شاہ ویر نے گہری سانس لی اور اسے کام شروع کرنے کا اشارہ کیا۔جوزف ہنوز متفکر کھڑا تھا۔

"ڈارلنگ کیا میں دس منٹ بعد کال کر سکتا ہوں؟" محبت، چاہت، منت کیا نہیں تھا اسکے لہجے میں؟"پلیز؟"

سسکیوں کے درمیان دوسری طرف اجازت دی گئی۔ اور اسی لمحے جینی نے سوئی چبھوئی۔ مٹھیاں بھینچتے ہوئے شاہ ویر حلق کے بل چیخا۔ درد، تڑپ، جلن وہ زور زور سے کراہنے اور، بلند آواز میں چیخیں مارنے لگتا۔

"ریلیکس شاہ ویر ریلیکس۔" جوزف اسکے کندھے پر ہاتھ رکھے تسلی دے رہا تھا۔ شاہ ویر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کہ خود کو ختم کر دے۔

تقریباً دو گھنٹے بعد وہ سیاہ صوفے پہ لمبا لیٹا ہوا تھا۔ آراہ سے بات کرنے کے بعد اس پر بے ہوشی طاری ہوئی تھی اور وہ دس منٹ قبل ہوش میں آیا تھا۔ پین کلرز کی کثیر مقدار نے اسکا درد کم کر دیا تھا لیکن خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اسکی رنگت سفید پڑ رہی تھی۔ ہونٹ پیڑھی زدہ معلوم ہو رہے تھے وہ لمبے لمبے سانس لیتا بمشکل اپنا تنفس بحال کر رہا تھا۔ فلیٹ تقریباً صاف ہو چکا تھا۔ اسکا سفید ٹریک سوٹ اب کچرے کی زینت تھا اور وہ اس وقت عام سے سیاہ رنگ کے ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ سیاہ ہی رنگ کی ہڈی ایک طرف پڑی ہوئی تھی۔ جسم فلحال کسی بھی شرٹ سے خالی تھا۔ اور ٹانکوں کے اوپر پٹی بندھی تھی۔ اسکی ورزشی جسامت پر بندھی پٹیاں اسے کمزور ظاہر کر رہی تھیں۔

"اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟" ایلکس اسکے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ سیاہ رنگت اور بھاری بھرکم جسم والا مرد متفکر دکھائی دے رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بند آنکھوں سے بڑبڑایا۔ پھر آنکھیں کھول کر جوزف کو دیکھا۔ "سی سی ٹی وی سے کچھ ملا؟"

"نہیں۔ گلی کے دونوں سی سی ٹی وی بند کیے گئے تھے۔ آگے ایک کافی شاپ تھی اسکا فوٹیج ڈیلیٹ ہے میں اپنے تئیں پھر بھی۔۔۔۔۔"

"رہنے دو کچھ نہیں ملے گا۔" اس نے قطعیت سے کہا۔ "یہ بات ہمارے درمیان رہنی چاہیے پولیس، میڈیا یا پھر میرے گھر والوں کو کوئی علم نہ ہو پائے۔" ایلکس نے سر ہلا دیا۔ "یہاں آکر میری مدد کرو۔" اس نے ہوڈی کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے ایلکس سے کہا۔وہ اٹھ کر شاہ ویر کے قریب آیا اور ہوڈی پہننے میں اسکی مدد کرنے لگا۔جوزف چپ چپ دکھائی دے رہا تھا۔اسے شاہ ویر کے لئے فکر ہو رہی تھی۔کھٹکا بھی۔

"یہ کب سے ہو رہا ہے؟"اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے پوچھا۔

"تین ماہ۔"

"اور تمھیں کیا لگتا ہے یہ سب کیا ہے؟"

"قتل سے پہلے مجھے ذہنی مریض بنانے کے حربے۔"

"تمھیں نہیں لگتا وہ کامیاب ہو رہا ہے؟کوئی نارمل انسان اپنے خاندان سے ایسی باتیں نہیں چھپاتا۔"

"کیا میں نے کبھی نارمل ہونے کا دعوی کیا ہے؟"ابرو اکھٹے کیے اس نے سپاٹ انداز میں پوچھا۔جوزف نے مزید کچھ نہیں کہا۔"میں یہ سارا معاملہ خود دیکھ لوں گا۔میرے گھر والے میلوڈرامہ کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔"

"اوکے۔"جوزف نے ہر بحث ختم کرتے ہوئے کہا۔البتہ وہ کچھ سوچ چکا تھا۔

شاہ ویر چاہے اس پر شک کرتا ہو چاہے خود کو ہر فن مولا سمجھتا ہو مگر شاہ ویر بنگش اسکا دوست تھا۔اسکی انگلیاں اب اسی دوست کے گھر والوں کو ایک اہم خبر سے مطلع کر رہی تھیں۔

"تین ماہ سے شاہ ویر کسی سے ہراس ہو رہا ہے اور آج اس نے شاہ ویر پر جان لیوا حملہ کیا ہے۔اگر اپنے بھائی کی زندگی چاہتے ہو تو کچھ کرو اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے۔"

جس وقت شاہ ویر ایلکس سے اپنی دوائی اٹھا کر دینے کو کہہ رہا جوزف ریچرڈ اسی پیغام کو"شاہ زید"نامی شخص کی طرف ارسال کر چکا تھا۔

★★★★★★★★★★★★

"دو سال قبل"

"نیویارک، ٹائم اسکوائر"

ٹائم اسکوائر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ملکوں، قوموں اور ثقافتوں کا سنگم۔

ٹائم اسکوائر کی سرخ سیڑھیاں سڑک کے اطراف میں بنی تھیں۔ جہاں ہر روز لاکھوں سیاح اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں۔ انہی سرخ سیڑھیوں کے سامنے کبھی کوئی بینڈ گانا بجا رہا ہوتا ہے، تو کبھی کوئی آرٹسٹ اپنے منہ سے آگ نکال رہا ہوتا ہے، کئی دفعہ چند منچلے لڑکے لڑکیوں کا گروپ یہاں رقص دکھا رہا ہوتا ہے، کئی بار گٹار پر پرفارمنس دی جاتی ہے۔ ٹائم اسکوائر ایک ایسی جگہ ہے جہاں لوگ مسکراتے ہیں، جہاں آپ ساری دنیا سے آئے مختلف تہذیب اور ثقافت کے لوگوں کو دیکھ پاتے ہیں۔ اگر اس جگہ کو

World wide meetup place کا نام دیا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔ یہاں اونچی اونچی عمارات ہیں جن پر لگی اسکرینز پر ہر دم کسی نہ کسی اشتہار کا چلنا لازمی ہے۔ کیونکہ یہی چلتے اشتہاروں کی روشنیاں ٹائم اسکوائر کی رونق تھیں۔ اس جگہ سے روزانہ لاکھوں لوگ گزرتے تھے، لاکھوں انہی روشنیوں کو دیکھ کر ٹھہرتے تھے، اور لاکھوں

یہاں کھل کر ہنستے تھے۔

اس وقت بھی سرخ سیڑھیوں پر کئی مقامی اور غیر مقامی لوگ بیٹھے تھے۔ سامنے ہی ایک بینڈ گانا بجا رہا تھا۔ سیاہ فام امریکی نوجوانوں کا بینڈ گٹار پر دھن بنا رہا تھا۔ ان کے بال چھوٹی چھوٹی چوٹیوں میں گوندھے ہوئے تھے، لباس

ایک جیسا اور گلے میں زنجیریں ڈلی تھیں۔ آٹھ لڑکے اور دو لڑکیوں کا یہ گروپ رونق بڑھائے ہوئے تھا۔ انارا طارون سرخ سیڑھیوں پر بیٹھی دکھائی دے سکتی تھی۔

It's the most wonderful time of the year

کئی برس پرانا کرسمس گیت قدیم طرز میں گنگنایا جارہا تھا۔ اس گیت کا نیا طرز بھی آچکا تھا۔ لیکن شاید لوگوں کو اب بھی وہی قدیم طرز پسند تھا۔

سرخ سیڑھیوں پر بیٹھی آراہ نے چہرہ بگاڑا، جمائی بمشکل روکی۔ "پتہ نہیں کس کی ماں مری ہے جو ایسا گانا گا رہے ہیں منحوس نہ ہوں تو۔"

اسکی آواز اگلے زینے پر بیٹھے ماسک والے لڑکے کے کانوں تک گئی۔ اس نے ٹھہر کر، بے یقینی سے گردن موڑ کر دیکھا وہ بلکل اسکے سامنے تھی۔ جس زینے پر وہ بیٹھا تھا اس سے عین اوپر والے زینے پر۔ شاہ ویر نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اب قسمت بار بار انکے راستے ملا رہی ہے تو اسکی سن لینی چاہیے۔

ماسک پہنے لڑکے کی آنکھیں ایک بار پھر چھوٹی ہوئیں۔ وہی مسکراہٹ۔

،"میں تمہاری تائید کرتا ہوں۔" بینڈ کے بے سرے راگ میں بھی آراہ اس آواز کو پہچان گئی۔ اس نے کرنٹ کھا کر نیچے دیکھا، وہ گردن پیچھے ڈھلکائے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے آراہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ شاہ ویر نے سر جھٹکا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اسکے ساتھ ذرا فاصلے پر آکر بیٹھا۔ درمیان میں آراہ کا سیاہ بیگ تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کسی فریم میں نظر آتے تو یقیناً بہترین لگتے۔

"اگر تم سوچ رہی ہو کہ میں تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا ہوں تو تم غلط ہو۔" وہ بلند آواز میں بولا تھا تاکہ اس چلتے گیت کے باوجود آراہ اسکی آواز سن لے۔ وہ آواز سنتی یا نہ اسکی مسحور کن خوشبو محسوس کر سکتی تھی۔

"تو پھر میں اسے اسے کیا سمجھوں؟؟"لڑکی کا اشارہ اسکی یہاں موجودگی کی جانب تھا۔

شاہ ویر نے گردن موڑ کر اسکی آنکھوں میں دیکھا۔اسکی ہیزل آنکھیں جن کے گرد سیاہ لکیر بنتی تھی۔مری کی برف باری، کتاب دستخط کی وہ تقریب، برف میں پھنس جانا اور وہ ٹھنڈا لمس شاہ ویر کو اس اتفاقاً ملاقات نے سب کو یاد دلایا تھا کہ وہ ان آنکھوں کو کبھی بھول نہیں پایا تھا۔یہ لڑکی اسکی زندگی کی کتاب میں کسی پسندیدہ باب کی طرح محفوظ تھی۔ان مٹ، یادگار۔

"تم اسے ایک اتفاق کہہ سکتی ہو۔"وہ نگاہیں ہٹا کر سنبھلا۔

آراہ نے تھکی تھکی سانس خارج کی۔"جانے ساری دنیا کے سارے اتفاقات تمھارے ساتھ ہی کیوں ہوتے ہیں۔"

"میرے ساتھ اتفاق نہیں ہوتے میں خود ایک چلتا پھرتا اتفاق ہوں۔"

"ایک اسٹالکر اتفاق۔"۔

"ایک stunning اتفاق۔"شاہ ویر نے بھی جتایا۔آس پاس لوگ تصاویر کھینچنے لگے تھے۔بینڈ ممبران اب اپنے اوپر وارے ہوئے پیسے سمیٹ رہے تھے۔ٹائم اسکوائر جھلملا رہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے میں تم سے لفظوں میں نہیں جیت سکتی۔"آراہ نے باقاعدہ ہاتھ اٹھالئے تھے۔بینڈ جانے لگا تو اب انکی جگہ کوئی ایشین غول گٹار اور مائیک لیے آ گیا۔آس پاس شور بڑھ گیا۔ہندوستانی، پاکستانی اور بنگلہ دیشوں نے ہوٹنگ کر کے سارا ٹائم اسکوائر سر پر اٹھالیا۔

"لفظوں میں مجھ سے جیتنے کے لئے سامنے والے کو میرے جیسا ہونا چاہیے۔"شاہ ویر اس سے نگاہ نہ ہٹاتے ہوئے

اپنے برادران کے لیے تالیاں بھی بجا رہا تھا۔

"تمھارے جیسا کیسا؟زیادہ بولنے والا؟"

"اونہوں زیادہ لکھنے والا۔ "اس نے جتا کر کہا۔ آراہ گہری سانس لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ بال چہرے سے ہٹائے۔ کوٹ درست کیا، اور مٹھیوں کے درمیان پھونکیں مار کر خود کو گرمائش پہنچانی چاہی۔ دوسری طرف کوئی پاکستانی گانا گایا جا رہا تھا۔ آس پاس کھڑے پاکستانی اور ہندوستانی ساتھ گانے لگے۔

"خیر مجھے چلنا چاہیے کافی وقت ہو گیا۔ "اس نے سیڑھیوں پر رکھا اپنا نیلا پرس جھک کر اٹھایا۔ اسکی پٹی کندھوں پر درست کی۔ شاہ ویر اسکے ساتھ اٹھا۔

"کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟ "اس نے مہذب انداز میں سوال کیا۔ آراہ نے ابرو استہفامیہ انداز میں اٹھائے۔ شاہ ویر نے کہنا جاری رکھا۔ "اگر کل شام تم مصروف نہیں تو کیا تم میرے ساتھ براڈوے چلو گی (ایک قسم کا تھیٹر)۔ "

انارا طارون کو نیویارک آئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ فرنگی ثقافت میں کسی مرد کا ایک لڑکی سے کافی، براڈوے یا ڈرنک کا پوچھنا وہ اسکا مطلب بہت خوب سمجھتی تھی۔ یا تو وہ میل جول بڑھانا چاہتا ہے، یا پھر وہ سامنے والی کو مستقبل کی "گرل فرینڈ" دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسی پیشکش یہاں معیوب نہیں سمجھی جاتی۔

"میں کسی اجنبی کے ساتھ براڈوے کیوں جاؤں گی؟ "اسکے لہجے میں مکمل اجنبیت تھی۔ "کل کلاں کو تم میرا گلا کاٹ کر سڑک پر پھینک گئے تو؟ "شاہ ویر گردن جھکا کر مسکرایا۔ واللہ یہ پہلی بار تھا۔ صنف مخالف سے بات کرنے میں پہل کرنا، اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیش کرنا اور پیش کش رد ہونے کی صورت میں وہی بات دوبارہ کہنا یہ واقعی پہلی بار تھا۔ وہ اس سے چار زینے اوپر کھڑا تھا۔ انکے درمیان بس تین زینے تھے اور ان پر بیٹھے لوگ تھے۔ کسی عمارت کی سرخ روشنی شاہ ویر کے چہرے پر پڑ رہی تھی وہ بس اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جس کا خیال پورے چھ ماہ اسکے ذہن و دل پر قابض رہا تھا۔ اسے کوئی الہام ہوا تھا کہ اس خیال، اور اس وجود کو وہ اگلی چھ زندگیوں میں بھی ذہن سے رفع نہیں کر پائے گا۔

"اگر میں شناسا نکلا تو؟ کیا تب میرے ساتھ براڈوے چلو گی؟ "بازو سینے پر باندھے خوشگواریت سے کہا۔

"تم شناسا نکلے تو آدھا نیویارک تمھارے ساتھ دیکھوں گی۔" وہ مقابلے کی دعوت دے رہی تھی آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ماسک ہٹانے کا کہہ رہی تھی۔ شاہ ویر نے جیسے اس مقابلے کو قبول کیا چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور اسی لمحے پی کیپ پہنے لڑکے نے ماسک کو ایک انگلی سے نیچے کیا تو اسکا چہرہ واضح ہوا۔ وہ صاف رنگت، اٹھی ہوئی ناک، اور بڑھی ہوئی شیو۔ وہ یقیناً وجیہہ مردوں میں سے تھا۔ آراہ جہاں تھی وہیں تھم گئی۔ ایک لمحے کے لئے وہ سانس تک نہ لے سکی۔ وہ اس چہرے کو پہچانتی تھی۔

شاہ ویر نے پی کیپ بھی اتار دی۔ بھورے بال بکھر سے گئے۔ اب وہ گلے میں لپٹا مفلر بھی اتار رہا تھا۔ اسکی اونچی گردن، اور اس میں پڑی سفید سونے کی چین۔ آراہ اس آدمی کو کہاں بھول سکتی تھی؟ وہ ہنوز سکتے میں تھی اسکی آنکھیں بے یقینی سے کھلی کی کھلی رہ گئیں، لب ہلکے سے وا تھے۔ وہ جس کے سامنے کھڑی تھی وہ شخص شاہ ویر بنگش تھا۔ انارا طارون کیا اسے تو سارا پاکستان جانتا تھا۔

"شاہ... ویر... شاہ ویر.. بن.. گش۔" کئی لمحے بعد اس کے لبوں سے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے تھے۔ اسکے ساتھ ہی اس نے بے ساختہ دل کے مقام پر ہاتھ رکھا شاہ ویر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا محظوظ سا۔ گانے اور ہوٹنگ کی آواز تیز ہو گئی۔

"کیا اب تم میرے ساتھ براڈوے چل سکتی ہو؟ کل شام پانچ بجے کیسا رہے گا؟" وہ اپنی دلکش مسکراہٹ کے درمیان بولا تھا۔ تین زینے اوپر ٹھہرا یہ شخص اسکا پسندیدہ لکھاری تھا۔ اسے یوں اچانک سامنے دیکھنا یہ اتفاق تو بہترین تھا، خواب تھا تو اسے ختم نہیں ہونا چاہیے تھا۔

کئی لمحے یونہی بے یقینی میں گزرے، پھر وہ آگے آئی ایک انگلی بڑھا کر اسکے کندھے کو چھوا۔ یہ وہی تھا کوئی بھرم نہیں، کوئی برف سے اٹی مصوری نہیں۔ وہ سالم حقیقت کی طرح سامنے موجود تھا۔

اسکی سانولی رنگت سرخ پڑ رہی تھی۔ جذبات، یہ جذبات ہی کی وجہ سے تھا۔ وہ اسکے عین سامنے کھڑا تھا، وہ جسے بس ٹی وی، موبائل میں دیکھا تھا۔ وہ جو دسترس سے بہت دور رہا تھا۔ وہ جسکی کتابیں لینے کے لئے اس نے کتنے ہی روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ آراہ پلک تک نہ جھپک سکی۔ وہ جھپکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"مس انارا طارون کیا آپ کل شام پانچ بجے میرے ساتھ براڈوے چلنا چاہیں گی؟" وہ دوبارہ پوچھ رہا تھا۔ وہ انکار کرے تو بدبخت کہلائے۔

★★★★★★★★★★†

سیاہ رنگ کی ہیوی بائیک اسلام آباد موٹروے پر اس تیزی سے فراٹے بھر رہی تھی کہ دیکھنے والی ہر آنکھ کے ساتھ اسکا کھیل آنکھ مچولی کا تھا۔ سیاہ رنگ کی جینز کے ساتھ ہم رنگ شرٹ اور سیاہ ہی چمڑے کی جیکٹ پہنے ایک اونچے لمبے، اور کسرتی قامت والے مرد نے بائیک کے دونوں ہینڈل مضبوطی سے جکڑ رکھے تھے۔ سیاہ دستانوں سے نظر آتی اسکی آدھی انگلیاں قوت لگانے کے باعث سرخ پڑ رہی تھیں۔ ہیلمٹ کے ادھ کھلے شیشے سے نظر آتی اسکی گہری بھوری آنکھیں کسی سوچ میں تھیں۔ انگلیوں کی ہڈیوں میں ہلکی ہلکی خراشیں تھیں شاید اسکا حادثہ ہوا تھا۔ حادثہ

پہلے بھی ہوا تھا، اسلان یمن آج تک ان چار سالوں کی قید میں تھا۔ اور نہ جانے کتنے سال مزید اس سزا کو جھیلتا۔

وہ اس بائیک پر اکیلا تھا مگر اسکے تصور میں دکھائی دیتا ایک اور وجود بھی تھا جس نے تصور سے حقیقت میں قدم رکھا، اسلان کو دیکھ کر اسکے لبوں پر مسکراہٹ آئی۔ اور اسلان نے اپنے کندھوں پر کسی کا لمس محسوس کیا۔ وہ ہر دفع آجاتی تھی، اسکی تنہائی کی ساتھی، وہ جو بھرم جیسی حقیقت تھی۔ اسکے سفید نیل پالش میں ڈوبے ہاتھ اسلان کے کندھوں پر تھے۔ وہ نشست سے اٹھ کر کھڑی تھی، ہیلمٹ اتارے وہ جوش سے چلا رہی تھی۔ سیاہ

جینز کے ساتھ سیاہ جیکٹ میں وہ بائیکر کی ہمسفر لگ رہی تھی۔ کس اور دنیا کی، یا شاید کسی اور دنیا جا چکی۔

"میں سپیڈ بڑھا رہا ہوں، پنار۔ گرفت مضبوط کرو۔" اس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ہواؤں میں اسکی آواز دب گئی۔

"فل تیز چلاؤ، اور سپیڈ بڑھاؤ۔"

"پنار نیچے بیٹھو تم گر جاؤ گی۔" وہ رفتار کے باعث حلق کے بل چیخ رہا تھا۔ دونوں کی آوازیں فضاؤں میں معلق ہو رہیں تھیں، یا شاید مستقبل کے لیے امر ہو رہی تھیں۔

"مجھے یقین ہے تم مجھے گرنے نہیں دو گے تیز چلاؤ۔" وہ نیچے بیٹھی۔ اسلان کو مضبوط سے تھاما اور گردن پیچھے کی

طرف گرا دی۔ اسکے چھوٹے کندھوں تک آتے بال ہوا سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ہیلمٹ سر پر واپس ٹکاتے ہوئے اب وہ ہنستے ہوئے پیٹ میں ابھرتی تتلیوں کو قابو کر رہی تھی۔ گول مٹول چہرا اور چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی۔ بائیک چلاتے ہوئے اسلان یمن کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ ان دنوں وہ خوش رہا کرتا تھا۔

ہواؤں سے باتیں کرتی ہیوی بائیک اب نظر کا دھوکہ بن گئی اور اسی دھوکے میں اسلان یمن بھرم سے حقیقت میں آ گیا۔ اب کوئی اسکے عقب میں نہیں تھا۔ اب نشست خالی تھی۔ اب کوئی نیل پالش کے مختلف رنگوں والے ناخن اسے اپنے قریب نہیں دکھائی دیتے تھے، اب کسی کے بال بائیک چلاتے ہوئے اسکے کندھوں پر نہیں پھسلتے تھے۔ اب تو بہت کچھ بدل گیا تھا۔ شوق بھی، لوگ بھی، زندگی بھی اور اسلان یمن خود بھی۔ بدلاؤ بھلا ہر دفع راس تھوڑی آتے ہیں؟

شام رات میں ڈھل گئی تھی۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر سٹریٹ پولز جلنے لگے تھے۔ اسلان کی بائیک کی رفتار اب بہت کم تھی کہ وہ ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ ہیلمٹ اب اتر چکا اور اسکے بال بکھر کر ماتھے پر پھیل چکے تھے۔ اس کالونی میں قطار در قطار خوبصورت اور عالی شان گھر بنے تھے۔ اسلان ایک سیاہ رنگ کے بنگلے کے

گیٹ سے کچھ فاصلے پر آ کر بائیک روک چکا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ یہاں کھڑے ہو کر بالکنی کو دیکھتا رہا۔ اسے معلوم تھا اب وہاں کوئی نہیں آئے گا جو اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا کرے، کبھی غصہ کرے یا کبھی اسے دیکھ کر مسکرائے لیکن وہ خود کو یہاں آنے سے روک نہیں پاتا تھا۔ اب تو آدھی دنیا اسکے یہاں آنے کے خلاف تھی اور دل اس آدھی دنیا کے خلاف۔ وہ شاید دل کے ساتھ تھا۔

وہ ہیلمٹ ہاتھ میں لیے اوپر دیکھ رہا تھا جب سیاہ بنگلے کے عین سامنے والے بنگلے کا دروازہ کھلا۔ کوئی پچیس چھبیس برس کا لڑکا ہاتھ میں کتے کا پٹا تھامے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسلان کی ہیوی بائیک اور اسکی اٹھی ہوئی گردن دیکھ وہ رک گیا۔ ایسے جیسے کوئی ٹھٹھک کر رکتا ہو۔

"اب یہاں آنے کا کیا فائدہ؟" اسے ہنوز بالکنی کی طرف دیکھتا پا کر کسی نے اسکے عقب سے کہا۔ اسلان مڑا نہیں لیکن وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔ "کتنے سال ہو گئے ہیں یار اب موو آن کرو۔ اسکے بھائی نے تمھیں یہاں آنے سے منع کیا تھا ناں؟"

اسلان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس تاریک بالکنی کو دیکھتا رہا۔ "سکندر صاحب یہاں سے شفٹ ہونے کا سوچ رہے ہیں۔ یہ چند سال انکی زندگی میں بہت بڑا طوفان لائے ہیں۔ انکی جان سے پیاری بیٹی مر گئی اور۔۔۔۔۔۔"

"کیا تم نے اسکی لاش دیکھی ہے؟" اسلان کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

"لاش نہیں دیکھی تو کیا ہوا کوئی اتنے سال غائب رہے تو اسکا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

"یہ کہ وہ اس وقت بہتر جگہ موجود ہے۔" اسلان کی آواز اتنی ہلکی تھی کہ وہ بمشکل خود سن سکا۔ عاقب کو غصہ آیا۔ پنار سکندر اسکی چچا زاد بہن اسکی پہلی دوست تھی۔ اسلان سے اسے کوئی نفرت یا انتقام نہیں تھا لیکن ۔۔۔۔۔ اب بس وہ اسے یہاں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

"وہ چار سال سے غائب ہے، اسلان۔ چار سال سمجھتے ہو تم؟ اور غائب ہونے سے پہلے اسکی آخری لڑائی تم سے ہوئی تھی، وہ آخری بار تم سے ملی تھی اور اسکا واحد مسئلہ تمھارے ساتھ تھا۔ تم کیسے انسان ہو؟" وہ بولتے بولتے جیسے ہانپ گیا۔ "اگر تم نے اسے مار دیا ہے تو کم از کم ورثاء کو اسکی لاش تو دے دو۔"

اب کے وہ دھیرے سے مڑا۔ گہری سپاٹ نظروں سے عاقب کو سر تا پیر غور سے دیکھا۔ وہ جو کسی جواب کا متمنی تھا.....

"وہ بہتر جگہ پر ہے، مجھے یقین ہے۔ وہ جہاں بھی ہے پر سکون اور آزاد ہے۔"

اسی لمحے اسکا فون بجنے لگا۔ اسلان نے جیکٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ "چاچو اسکار کالنگ" کے الفاظ جل بجھ کرنے لگے۔ اسلان نے گہری سانس لیتے ہوئے کال کا جواب اثبات میں دیتے موبائل کان سے لگایا۔

"کہاں ہو تم؟" دوسری طرف وہ درشتی سے بولا۔ ہاتھ میں پکڑے موبائل پر اسلان کی لوکیشن تھی۔ اسلام آباد کا وہی علاقہ جہاں جانے پر اسے پابندی تھی۔ "تم دفع 107 کے خلاف جا رہے ہو۔") اگر کسی انسان کو دوسرے سے کوئی جانی خطرہ ہو تو فریق اول عدالت میں جا کر فریق دوئم یعنی جس سے خطرہ ہے اس سے عدالت کے زریعے نقص امن کی ضمانت حاصل کر سکتا ہے۔ پنار سکندر کی گمشدگی کے بعد سکندر خاندان نے اسلان یمن سے 107 لیا تھا)

"میں جہاں بھی ہوں آپ کا موبائل بتا رہا ہوگا ہے ناں؟" وہ تلخی سے بولا۔ "دنیا چاہے جو کہے لیکن آپ تو مجھے کرمنل مان چکے ہو اسی لیے میرے پیچھے لوگ لگاتے ہو؟ اسی لیے میرے موبائل میں خفیہ ایپس ڈلواتے ہو؟" اسکا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے لہو اتر رہا ہو۔ اسکا بس نہیں چلتا تھا کہ دنیا کو آگ لگا دے۔

"میں کہہ رہا ہوں واپس گھر پہنچو خبیث آدمی۔" سہراب اسی سختی سے بولا۔

"میں آپ کے باپ کا نوکر ہوتا تو ضرور آپ کی بات پر عمل کرتا۔"

"اسلان..... " سہراب نے بے حد تحمل سے اسے پکارا۔ "اگر تم اگلے پانچ منٹ میں وہاں سے نہیں نکلے تو........
"

"میں نے کہاناں چاچو اسکار میں آپ کے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔"

"اسلان... ہیلو.. ہیلو اسلان میں کچھ کہہ رہا ہوں۔" سہراب کہتا رہ گیا مگر کال کٹ چکی تھی۔ موبائل ہاتھ میں لیے وہ بل کھا کر رہ گیا۔ طیش اسکی ساری رگوں میں خون کی طرح دوڑنے لگا۔ وہ ابھی ابھی گھر آیا تھا اور ایک نیا مسئلہ تیار کھڑا تھا۔ بعض دفع وہ سوچا کرتا تھا کہ اگر وہ یافث کی طرح نرم ہوتا تو کیا مسائل اس سے کنارہ کر لیتے؟ یا اگر وہ عالمگیر کی طرح بے حس ہوتا تو ہر فکر سے نبرد آزما ہو جاتا لیکن وہ سہراب یمن تھا۔ وہ ان دونوں کی طرح نہیں بن سکتا تھا۔

کتنے ہی لمحے وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے راہداریوں میں کھڑا رہا۔ اسلان کو کتنی دفع میسج اور کال کیے مگر جواب ندارد۔ اس نے کنپٹی کو مسلا، ہونٹ کاٹے پھر ڈھیر ساری انا کو بر طرف کرتے خود پر دس دفع لعنت بھیجتے ہوئے اس نے یافث طارون کا نمبر ملایا۔ گھنٹی جا رہی تھی، اور یہی گھنٹی اسکے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ چند پل بعد کال اٹینڈ ہو گئی تھی۔ سہراب بس گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"ہیلو؟ سہراب؟" دوسری طرف یافث کی آواز مصروف تھی۔ اسکے پاس بے تحاشا شور تھا۔

"کہاں ہو تم؟"

"اسلام آباد آیا تھا ایک کام کے لیے ابھی نکل...."

"اسلان پنار سکندر کے گھر کے باہر موجود ہے۔ اسے دس منٹ کے اندر اندر وہاں سے نکالو۔"

"اوہ اوکے۔" وہ سنبھلا۔ "تمہاری اس سے بات ہوئی ہے؟ کیا کہہ رہا ہے؟"

"ظاہر ہے میری بات ہوئی ہے اور اسکا دماغ خراب ہو گیا ہے اسی لیے تمھیں کال کر رہا ہوں۔ کیا جتانا چاہتے ہو کہ وہ مجھ سے زیادہ تمہاری سنتا ہے؟" سہر اب پھٹ پڑا۔ یافث کے سامنے اسے غصہ بھی آتا تھا اور اسکا اظہار بھی۔ کم از کم یافث کے سامنے وہ خوامخواہ کے ملمعے نہیں چڑھاتا تھا۔

"تمھارے پاس دس منٹ ہیں وہ مجھے اس ایریا سے باہر چاہیے ورنہ ابھی تم دونوں مجھے جانتے نہیں ہو۔"

"میں بات کرتا ہوں، ڈونٹ وری۔" وہ اس وقت بِھڑنے کے موڈ میں ہر گز نہیں تھا سو ہتھیار ڈال دیے۔ موبائل بند کر کے یافث اب اپنے راستے بدل رہا تھا۔ سہر اب موبائل وہیں میز پر رکھے کرپر بیٹھ گیا۔ اسکی آنکھیں دُکھ رہی تھیں۔ بھوک الگ لگی تھی، سر شدید درد کر رہا تھا مگر جب تک اسلان واپس نہ آجائے اسے چین کسی پل نصیب نہیں ہوناتھا۔ دوسری طرف انارا طارون تھی جو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ مار چکی تھی۔ وہ کرے تو کیا کرے؟

★★★★★★★★★★★★★★

شہر:راولپنڈی

وقت:شام چھ بجے۔

اندرون راولپنڈی پرانے طرز کی عمارتوں کا مرکز ہے۔ تنگ و تاریک لمبی لمبی گلیاں، عمارتوں کی خوبصورت بالکنیاں، اور لوگوں کا بڑھتا ہوا رش کسی ساحر جادوگر کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیتا ہے۔ یہاں پہلی بار آنے والا کوئی بھی شخص یہ ضرور سوچتا ہو گا کہ اسی نوے برس قبل یہ شہر کس جاہ و جلال کا مالک رہا ہو گا، یا پھر شاہی دور کیسا عالیشان رہا ہو گا؟ لوگوں کے اس رش میں، بھیڑ بھاڑ کے اس جم غفیر میں ہماری کہانی کا ایک کردار بھی شامل ہے۔ جو اسی بھیڑ کا حصہ ہے۔

سیاہ شلوار قمیض میں خاکی شال کندھوں پر ڈالے اس نے ایک بستہ کندھے پر ٹانگ رکھا تھا۔ہاتھ میں آئی پیڈ تھا جس پر کوئی لوکیشن کھلی تھی سبز لائن اور سبز ہی نقطہ اسے راہ دکھا رہا تھا۔اسکی آنکھیں ہدف پر جمی تھیں۔دوسرے بازو پر کیمرے کا بستہ لٹکا تھا۔

"ہم دوبارہ وہاں کیوں جارہے ہیں؟یار مجھے نہیں لگتا وہ کچھ بتائے گا۔"اسکے ساتھ چلتی باب کٹ بالوں والی لڑکی بگڑ کر کہہ رہی تھی۔شاہ زید سنجیدگی سے چلتا رہا۔اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔

"پنڈی کے چھوٹے سے محلے کا وہ لڑکا پاکستان کی سب سے بڑے ڈاکے میں ملوث رہا ہے۔مجھے یقین ہے اسکا شیطانی دماغ اب بھی سکون سے نہیں بیٹھا ہوگا وہ کچھ پلان کر رہا ہوگا اور اس سے بات کرتے ہوئے مجھے کوئی نہ کوئی اشارہ ضرور ملے گا۔"زید نے تفصیلی جواب دیا۔پھر لمبی گلی میں ایک جگہ رک گیا۔لوگ آتے اسکے کندھے پر کندھا مار کر چلے جاتے،کوئی تیزی میں بوٹ سے پیر کچل کر آگے بڑھ رہا تھا۔یہ علاقہ وقت میں پیچھے لے جاتا تھا لیکن یہاں سے گزرنے والے وقت سے تیز رفتاری سے آگے تھے۔

"یہ تمہاری رپورٹ ہے کہ وہ لڑکا اس ڈاکے میں ملوث رہا ہے تم سچ نہیں جانتے،زید۔"لڑکی اسکے ساتھ رک گئی۔زید اب اپنا کیمرہ آنکھ سے لگائے گردن اونچی کیے نیلے پینٹ میں ڈوبی قدیم عمارت کی تصویر اتار رہا تھا۔"مجھے تو لگتا ہے تم صرف اور صرف اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔"

"اور تم میرا دماغ۔""سہولت سے کہتے اس نے کیمرہ آنکھ سے نیچے اتارا۔پھر اسے دیکھا جو ساتھ تھی۔

"اگر میرا آنا اتنا ہی برا لگ رہا تھا تو ساتھ لائے کیوں؟"

"مجھے اپنا دماغ خراب کروانے کا شوق تھا۔"

"لعنت ہو تمہارے شوق پر۔"

"تھینکیو سو مچ۔"جواباً وہ اتنی ہی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی سے کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

"ایک رپورٹ بنانے کے لیے اور کتنا خوار ہونا پڑے گا۔"گلی کے اختتام پر ایک قالینوں کی دکان تھی۔شاہ زید نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو اوپر وہی سبز رنگ کی لکڑی کی عمارت تھی۔دوبارہ نگاہ جھکائی تو موبائل کا سبز نقطہ اب پیر پسارے گوشہ نشین ہو چکا تھا کہ اس کا کام اب ختم ہوا۔ قالینوں کی دکان کے ساتھ ہی ایک گھر کا چھوٹا سا دروازہ تھا۔شاہ زید اب مدیحہ کی طرف مڑا۔

"میری بات غور سے سنو تم باہر کھڑی رہو گی اگر میں دس منٹ تک باہر نہ آؤں تو تم اندر آؤ گی۔شوٹ کرنے کی نوبت آجائے تو تم پیٹ، بازو اور پیر میں گولی مارو گی۔کوئی مرنا نہیں چاہیے۔" are we clear?

چہرے پر ماسک چڑھاتے ہوئے وہ جتنی سنجیدگی سے بولا اسکے سامنے کھڑی لڑکی کے ماتھے پر اسی تیزی سے بل آئے۔ساتھ ساتھ اشتعال بھی۔وہ شاہ زید بنگش کے ہاتھوں ایک بار پھر استعمال ہو چکی تھی۔کیا مطلب وہ ڈاکہ مارنے والے لڑکے سے سوال کرنے نہیں آئے تھے؟

"گولی، شوٹ، دس منٹ تک ہونے والی جنگ؟ آر یو سیریس؟ یہ کام آفیشل تھا ناں؟ تم ایک رپورٹ بنا رہے تھے اور باس نے تمھیں میرے ساتھ بھیجا تھا۔ہم لوگوں کو شوٹ کب سے کرنے لگے، زید؟" اسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شاہ زید کو ابھی کھڑے کھڑے ختم کر دے۔اتنی ہتک.... اُف اُف۔

اس نے گہری سانس لی بازو سینے پر باندھے اور اسکے سامنے آکر کھڑا ہوا۔

"اگر یہ آفیشل ہوتا تو اپنے ساتھ لانے کے لیے میرے پاس دس ذہین لوگ موجود ہیں۔یہ "ذاتی" ہے اور تم جانتی ہو میں اپنے ذاتیات میں تمھارے علاوہ کسی کو شامل نہیں کر سکتا۔"

"یعنی میں ذہین نہیں؟"

"میں گاڑی میں آکر سب بتاتا ہوں یار پلیز۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کی موجودگی یقینی بنائی۔کیمرہ کندھے پر ڈالا اور دروازہ بجایا۔ متواتر ہوتی دستک پر اندر سے ایک بے زار آواز آئی۔

”بوہا توڑ کے فیر مننا اے؟ آ رئی آں کھلو جاؤ۔ (دروازہ توڑ کر پھر ماننا ہے؟ آ رہی ہوں ٹھہر جاؤ)“

”تم اندر کتے کی موت مر جانا اور میں نہیں آؤں گی دیکھ لینا۔“

”اپنا نقصان کرواؤ گی مجھے کیا۔ مجھ جیسا دوبارہ کہاں ملے گا؟“ وہ الرٹ سا کھڑا رہا۔ دروازہ ایک بار پھر بجایا۔

”تم زندہ بچ کر آئے تو تمہیں میں ماروں گی۔“

”اپنا نقصان پارٹ ٹو۔“

دروازہ کھلا اور جس تیزی سے کھلا زید کا منہ دیکھ کر اسی تیزی سے اس کے منہ پر بند ہونے والا تھا جب اس نے برق رفتاری سے اپنا پورا زور لگایا اور دروازے کو کھلا رہنے پر زور دیا۔ اور آدھا دروازے کے بیچ میں آ گیا۔

”پنج منٹ دی گل اے۔ پنجاہ ہزار، تے تیرے پتر دے پنج منٹ۔ سودا بُرا نئی اے (پانچ منٹ کی بات ہے۔ پچاس ہزار اور تمھارے بیٹے کے پانچ منٹ سودا برا نہیں ہے)“

دوسری طرف عورت بکتے جھکتے دروازہ اسکے منہ پر بند کر رہی تھی مگر وہ پوری قوت لگائے دروازہ تھوڑا سا کھولنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ عورت اب بھی پنجابی میں اسے گالیاں بک رہی تھی اسے بار بار یہاں آنے پر کوسنے دے رہی تھی اور پھر جب اگلے چند منٹ کوئی مصالحت کام نہ آئی تو اس نے شاہ زید کی پسلیوں کے درمیان بندوق رکھ دی۔ مدیحہ جیسے کسی نیٹ فلیکس سیریز سے محظوظ ہو رہی تھی۔ دل تو کر رہا تھا چار پانچ مکے رکھ کر دے۔

”اگر تم زندہ نہیں جانا چاہتے تو میرے پاس تمھیں بھیجنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔“

شاہ زید نے تحیر زدہ ہو کر مدیحہ کو دیکھا جیسے کہنا چاہ رہا ہو۔ "بی بی تمھیں یہاں ماڈلنگ کے لیے نہیں لایا مدد کرو"

مدیحہ نے شانے اچکائے۔ ”تم نے کہا تھا گھر کے اندر مدد کرو، گھر کے باہر میری طرف سے مر جاؤ۔“

شاہ زید نے دانت پر دانت جمائے اور عورت سے ایک بار پھر منت کی۔"پانچ منٹ کا کام ہے ایک دو سوالوں سے تمہارا بیٹا مر نہیں جائے گا۔اندر آنے دو مجھے۔"

مگر وہ بھی ایسی تھی کہ کسی ماں نے ایسی ڈھیٹ جنی نہ ہو۔اس نے سائلنسر لگی پستول سے نیچے فائر کیا۔شاہ زید دروازے کا پٹ چھوڑ کر جیسے اچھل کر پیچھے ہوا اور یہی مدیحہ کے صبر کی حد تھی۔وہ آگے آئی شاہ زید کو کندھے سے ہٹا کر پیچھے کیا اور دروازے کی درز سے نظر آتے عورت کے ہاتھ کو بجلی کی سی تیزی سے پکڑا اور اس طرح سے مروڑا کہ پستول نیچے گر پڑا۔ساتھ ملامتی نظروں سے شاہ زید کو دیکھا۔

"تمھیں اتنا بھی نہیں آتا؟"

شاہ زید نے جھک کر پستول ہاتھ میں لی۔پھر ہلکا سا مسکرایا۔"میں نامحرم عورتوں کو ہاتھ نہیں لگاتا۔"وہ چہکا۔

مدیحہ سر جھٹک کر عورت کی طرف متوجہ ہوئی جو اب لاتوں سے وار کر رہی تھی۔مدیحہ نے دروازے پر لات مار کر اسے پورا کھول دیا،خود اندر آئی،عورت کے چہرے پر بغیر رکے تین چار تھپڑ دے مارے،پھر لات مارتے ہوئے اسے نیچے گرایا اور نیچے گری ہوئی عورت کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لی۔دروازے پر کھڑا شاہ زید تعریفی نظروں سے اسے تکتا رہا۔وہ اسے کیوں ساتھ لایا تھا اتنا تو سمجھ آ گیا تھا۔

"ویلکم سر،پچاس ہزار ذرا کم ہیں۔آپ ستر ہزار دیں اور ڈیل ڈن۔"مدیحہ اسی عورت کی نقل اتارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔عورت نے مزاحمت کی تو گرفت سخت ہو گئی۔ساتھ مدیحہ نے اسکے بالوں کو دو سے تین جھٹکے دیے۔زید نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا تھا۔اور ہلکا سا ہنسا۔

"انسان کی بچی بن جاؤ ابھی کچھ مل رہا ہے اگر زیادہ آئیں بائیں کی تو اگلی بار ہم پولیس کے ساتھ آئیں گے اور پھر بیٹا تو کیا تم سے بھی وہ سوال کریں گے جن کے جواب تمہاری ماں کو بھی نہیں پتا ہوں گے۔"

عورت کی مزاحمت دم توڑ گئی۔اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔یہ اشارہ تھا کہ وہ راضی ہے پیسے بڑھ گئے تھے،وہ

راضی ہو گئی تھی۔(اتنی وہ بیٹے کی سگی)

کوئی آدھے گھنٹے بعد زید اور مدیحہ ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھے تھے جہاں قدیم طرز کا پھٹا ہوا صوفہ رکھا تھا۔کمرے میں بدبو کے بھبھوکے الگ اٹھ رہے تھے۔ایک طرف پڑی الماری سے کپڑے باہر نکلے ہوئے تھے اندر کیا تھا شاہ زید سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

"ریکارڈنگ آن رکھنا۔"اس نے کمرے کا جائزہ لینا چھوڑ مدیحہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"بنگش خاندان کے ملازموں میں مدیحہ رضا کا نام شامل نہیں ہوتا۔"

"اتنا کیا بھڑک رہی ہو اتنی بڑی بات تو نہیں تھی۔"اب کے وہ سلگا۔

"میرا دماغ نہ چاٹو،زید۔ورنہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

ابھی اسکی بات پوری نہیں ہوئی تھی جب دروازے کی چوکھٹ پر گھر کی مالکن عورت کے ساتھ ایک لڑکا نمودار ہوا۔لمبا،پتلا جس کے چہرے پر مردنی چھائی تھی اور صحت تقریباًبرباد ہو چکی تھی۔وہ مشینی تاثرات لیے اندر آیا۔شاہ زید کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا۔زید کچھ لمحے خاموشی سے اسکا جائزہ لیتا رہا پھر دھیرے سے کھنکھارا۔

"تمھارے ساتھ جو ہوا مجھے اسکا افسوس ہے۔"

"سوال پوچھو صاحب۔"وہ اسی بے تاثر انداز میں بولا۔انداز میں ان کہا شکوہ تھا۔

زید نے ایک نظر مدیحہ کو دیکھا۔گلے میں گلٹی ابھر کر معدوم ہوئی۔اس نے لڑکے کے کمزور ہڈیوں کے ڈھانچہ ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"برہان کا قتل تمھارے سامنے ہوا تھا رائٹ؟"لڑکے نے سر ہلا دیا۔اسکا اضطراب بڑھ رہا تھا۔آنکھیں عجیب

تاثرات میں ڈھل رہی تھیں۔"تم وہ واحد انسان ہو جس نے قاتل کا چہرہ دیکھا ہے کیا تم مجھے بتا سکتے ہو وہ کیسا دکھتا ہے؟اسکا قد،اسکے بارے میں کچھ بھی۔میں تمھیں۔۔۔۔۔۔۔۔"

لڑکے نے نگاہیں اٹھا کر شاہ زید کو دیکھا۔اسکی آنکھوں میں کچھ زخمی پن تھا۔وہ کئی لمحے زید کو تکتا رہا۔پھر دھیرے سے کہا۔

"وہ ایک عورت تھی۔"اس نے زید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چبا چبا کر کہا۔"پولیس،انتظامیہ،جاسوس سب غلط انسان کے پیچھے ہیں۔وہ مرد نہیں تھا وہ ایک عورت تھی۔"

اس نے محض اتنا کہا اور تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔اسکے عقب میں بیٹھا شاہ زید کتنے لمحے بت بنا رہا اسے علم نہ ہو سکا۔

★★★★★★★★★★★★

وہ کب ہوٹل آیا اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔اپنے دونوں اطراف تکیوں کی باڑ بنا کر وہ نیند کی گولیاں کھا کر سو گیا۔کئی گھنٹے سوتے رہنے کے بعد بھی اسکے وجود سے تھکن اور درد ختم نہ ہو سکا۔درد اور تھکن کا قصہ پھر کبھی کوئی جان کے خوف کا کیا کرے؟اس نے متعدد دفع سوچا کہ اپنے گھر میں سب بتائے لیکن ہر دفع وہ اس خیال کو رد کر دیتا تھا،وہ نہیں بتانا چاہتا تھا کیونکہ اسے سامنے والوں کے پاس کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔لیکن شاہ زید ۔۔۔۔۔۔وہ شاہ زید سے کبھی کچھ چھپاتا نہیں تھا۔درد کے ساتھ اب گلٹ اور سوچیں بھی آن وارد ہوئیں۔

بہت دیر بعد وہ جب اٹھا تو درد شدت پکڑ چکا تھا۔اس نے شرٹ ہٹا کر دیکھا تو جسم پر لگے ہوئے ٹانکے واضح نظر آئے۔کیا وہ یہ سوچ کر سویا تھا کہ اٹھنے کے بعد یہ زخم،اور انکے نشان نہیں رہیں گے؟دو پین کلرز مزید پھانکنے کے بعد اس نے اپنا موبائل اٹھایا تو کچھ محسوس ہوا۔کوئی خالی پن جو اسکا سینہ جکڑ رہا تھا۔

"تم نے مجھے دو ہفتے سے کوئی ڈرافٹ نہیں بھیجا شاہ ویر۔"

"تم ایوارڈز میں کیا پہن رہے ہو؟"

"تمھیں واشنگٹن literary festival میں بلایا ہے؟"

سب اس سے وہ پوچھ رہے تھے جو وہ نہیں سننا چاہتا تھا۔ دنیا یونہی چل رہی تھی وہ جس جہنم سے گزر کر آیا تھا وہاں اگر جل کر راکھ بھی ہو جاتا تو کارِ دنیا نہ رکتا۔ کسی کو پرواہ نہ تھی کہ وہ کہاں تھا۔ کیا ایسے ہوتے ہیں لوگ؟

"تم ٹھیک ہو، شاہی؟" ایلسا نامی رابطے کی طرف سے میسج سکرین پر دمک رہا تھا۔ شاہ ویر نے ٹھنڈی سانس بھری اور سر کو پلنگ کے تاج سے ٹکا دیا۔ "تم نے ایسے اچانک کال بند کر دی پلیز کچھ بتاؤ کیا ہوا ہے۔ مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔" وہ کتنی ہی دیر سکرین سے نگاہیں نہیں ہٹا سکا۔ کم از کم زندگی کا یہ فیصلہ اسے سربلند کرے گا وہ جانتا تھا۔ یہ ورت آندھی اور طوفانوں میں اس کا ہاتھ مضبوط سے تھام کر کھڑی رہے گی۔ یہ دنیا نہیں تھی یہ دل تھی اور دل تو

خالص ہوتا ہے ناں؟

"مجھے کال کرو، آراہ۔ پلیز۔" اس نے لکھ کر بھیجا۔ وہ خود بھی کال کر سکتا تھا لیکن اس وقت وہ اس نہج پر تھا کہ دل چاہتا تھا کوئی بس فکر کرے، سنبھال لے۔ اور وہ صحیح انسان کے پاس گیا تھا۔

پیغام جونہی نیویارک سے لاہور پہنچا کمرے میں پریشانی سے ٹہلتی ہوئی لڑکی تیزی سے موبائل تک آئی اور جلدی جلدی اسے کال ملائی۔ دوسری طرف شاہ ویر بس سکرین تکتا رہا۔ چاہے جانے کا احساس اگر انسان کو فخر بخشتا ہے تو شاہ ویر بنگش کا قلب تفاخر سے بھر گیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔" کال کا جواب دیتے ہوئے وہ مدھم لہجے میں بولا۔

"تم ٹھیک ہو ناں؟"

"اگر میں تم سے کہوں کہ میرے سارے پیسے کہیں غرق ہو گئے۔ ساری دنیا میرے خلاف ہو گئی لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں تو تم کیا کرو گی؟" وہ سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے بے حد مدھم اور ہارے ہوئے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

دوسری طرف وہ ٹھہر گئی۔ چند پل خاموشی سے لب چباتے رہنے کے بعد اس نے راز داری سے کہا۔ "پھر میں تم سے کہوں گی کہ فکر مت کرو میری نانی نے میرے حصے کچھ جائیداد چھوڑی تھی میں وہ تمھیں دے دوں گی۔ پیسے کا مسئلہ حل۔ دنیا کی پرواہ مجھے ہے ہی نہیں اور لوگ؟.....لوگ کبھی کسی کے سگے نہیں ہوتے۔ اس لیے تم کسی کی فکر مت کرو۔"

وہ بے تکی باتیں کرتی تھی اور شاہ ویر کو کسی عقلمندی کی کوئی حاجت تھی بھی نہیں۔

"اگر میں تمہارا پیسہ لے کر بھاگ گیا تو؟"

"گھاٹے کا سودا ہو گا۔ چند ٹکوں کی خاطر انارا طارون کو کھو دینا حماقت ہے۔"

شاہ ویر ہنس پڑا۔ "تم کتنی سیلف آبسیسڈ ہو۔"

"بات مت بدلو مجھے یہ بتاؤ تم پریشان کیوں ہو؟"

"جانتی تو ہو میں نہیں بتاؤں گا۔" وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔ "اچھا وہ چھوڑو یہ بتاؤ آج کیا ہوا؟"

"اوہ گاڈ آج پتا ہے کیا ہوا۔۔۔۔۔۔" وہ بولنا شروع ہو چکی تھی۔ شاہ ویر آنکھیں موندے، موبائل چہرے پر رکھے اسے سن رہا تھا۔ کچھ وقت تک کے لیے اسے جائے فرار مل گئی تھی۔ یہ کافی تھا۔ وہ بولتی رہے شاہ ویر سنتا رہے، بس بہت ہے۔

★★★★★★★★★★★★

"اسلان؟"

یافث نے کچھ زور دے کر اسے پکارا تو اسلان خیالوں سے باہر آیا۔ چونک کر اپنے سامنے بیٹھے یافث کو دیکھا۔ وہ دونوں اسلام آباد کی حدود سے باہر ایک ڈھابے پر موجود تھے۔ ذرا ذرا سے فاصلے پر بچھی چارپائیوں کے درمیان آگ کا الاؤ دہک رہا تھا۔ انکی چارپائی کے بے حد نزدیک ایک الاؤ تھا جس کی حدت کے باعث اسلان نے جیکٹ اتار کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ سادہ سیاہ ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔

"کچھ کھانا چاہو گے؟"

یافث الگ انسان تھا وہ اسلان سے کبھی ضد نہیں باندھ لیتا تھا، اسے حکم نہیں سناتا تھا، نہ ہی اسے بیٹھ کر سرزنش کرتا تھا۔ وہ انارا اور اسلان کے لیے ماں کی طرح تھا۔ نرم اور انکے کھانے اور خوشی کی فکر کرنے والا۔ کچھ دیر قبل اسے سہراب نے کال کی تو اس نے محض اسلان کو کال کر کے یہ کہا تھا کہ کیا وہ پندرہ منٹ میں اس سے ملنے آ سکتا ہے؟ اور وہ آ گیا تھا۔ وہ یافث کے سامنے پگھل جاتا تھا۔ ہر بچہ ماں کے سامنے نرم پڑ ہی جاتا ہے۔

"ہمم بھوک تو لگی ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔ یافث نے سر ہلاتے ہوئے بیرے کو بلوایا۔ آرڈر نوٹ کروایا اور ایک بار پھر اسکی طرف متوجہ ہوا۔ "آراہ نے تم سے کوئی بات کی ہے؟"

"اس لڑکے کے بارے میں؟" اسلان بغیر تمہید کے سیدھا مدعے پر آیا۔

"ہاں وہی۔"

"سب سے پہلے مجھے ہی بتایا تھا۔" رکھائی سے کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا۔ "عجیب پتا نہیں کون ہو گا وہ؟"

"غصہ آ رہا ہے یا غیرت؟" جگ سے پانی گلاس میں ڈالتے یافث نے غور سے اسے دیکھا۔ مسکراہٹ دبائی۔

"دونوں۔ اور آپ کو؟"

یافث نے ہنستے ہوئے شانے اچکائے۔ ”سمجھ نہیں آ رہی یار۔ دل کر رہا ہے اتاروں جوتا اور رکھ رکھ کر اس لڑکے کے سر پر ماروں۔ بے غیرت آدمی۔“

اسلان ہولے سے ہنسا۔ مدتوں بعد۔ ”اسکا کیا قصور؟ ظاہر ہے آراہ سے سبز سگنل ملا ہو گا اسے۔ ہر بار لڑکے کا قصور نہیں ہوتا۔“

”پھر بھی مجھے غیرت جو آ رہی ہے اسکا کیا کروں؟ کیا اس نے لڑکے کی کوئی شناخت وغیرہ بتائی ہے؟“

”مجھے نہیں اسکار کو بتائی ہو گی۔“

”تم اسے اسکار کہنا کب چھوڑو گے؟“ یافث ہنس رہا تھا۔ سہراب اس نام سے جتنا چڑتا تھا اسلان اسے اتنا ہی اسی نام سے پکارتا تھا۔ ”اسے تنگ مت کیا کرو کسی دن رگڑ کر رکھ دے گا۔“

”میں انکے باپ کا ملازم نہیں ہوں۔“

”اچھا دفع کرو۔“ یافث نے بات کو طول پکڑتے دیکھ مصلحت کو چنا۔ ”میں تو عالمگیر کے باہر آنے کا انتظار کر رہا ہوں اصل مزہ تو تب آئے گا ناں۔ جب اسے پتا چلے گا۔“

اسلان نے بھنویں اکھٹی کر کے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب مزہ آئے گا؟ یہ آراہ کی شادی ہے کوئی فیملی شو نہیں۔“ ایک لمحے کو اسکا لہجہ بالکل مختلف ہو گیا۔ یافث نے نوٹ کر لیا مگر کچھ کہا نہیں۔ ”عالم کب آئے گا؟“

کھانا آ گیا اور اسلان بھنے ہوئے قیمے کے ساتھ چپاتی کا نوالہ بنا رہا تھا۔ یہ تو وہ لڑکا تھا ہی نہیں جو اکھڑ اور بدتمیز تھا یہ کوئی بہت سادہ سا لڑکا تھا جس کا دائرہ چھوٹا اور ذہنی وسعت لا محدود تھی۔ جو باتیں کر بھی لیتا تھا اور بنا بھی لیتا تھا۔ وہ بالکل الگ انسان لگ رہا تھا۔

"چھ ماہ کی سزا لگی ہے اسے ابھی کچھ وقت رہتا ہے۔" یافث نے کہتے ہوئے بیرے کو اشارہ کر کے بلایا اور ایک بریانی کا آرڈر نوٹ کروایا۔ پھر وہ دوبارہ اسلان کی طرف متوجہ ہوا جو جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ "اسکو بھی پتا نہیں کیا شوق ہے یہ تیسرا سال ہے جب وہ مسلسل جیل کی شکل دیکھ کر آرہا ہے۔ کبھی دو تو کبھی چھ ماہ۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

"شکر کریں وہ ان کارناموں کی سزا میں جیل نہیں جا رہے جو لوگوں نے ان سے منسوب کر رکھے ہیں۔"

"اپنی تین بیویوں کا قتل؟"

وہ دونوں ساتھ مسکرائے۔ اسلان اب اسے کچھ بتا رہا تھا یافث سن رہا تھا ساتھ اس نے آنکھ بچا کر سہراب کو میسج بھیج دیا۔ "کام ہو گیا۔"

اسلان نے اسے میسج بھیجتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ یافث طارون کے معاملے میں وہ کافی فراخ دل تھا۔ یا شاید یافث بے وقوف تھا؟

ڈھابے کی روشنیوں سے دور مری کے اس دو کمروں والے کوارٹر میں سہراب یمن برف باری کے دوران چھت پر بنے سٹور روم نما کمرے میں داخل ہو رہا تھا جب اسکے موبائل پر یافث کا میسج جگمگایا۔ اس نے پیغام پڑھا اور موبائل جینز کی جیب میں ڈالا پھر کمرے کا سوئچ بورڈ جلایا۔ سارا کمرہ سرخ روشنی میں نہا گیا۔ اور اسی سرخ روشنی میں سہراب یمن قدم قدم چلتا ہوا آگے آیا۔ ذہن کے خانوں پر کئی معنی خیز آوازیں کسی بلند و بانگ دستک کی طرح گونج رہی تھیں۔ چہرہ یکدم بے حد مختلف نظر آرہا تھا۔ پر سرار، غیر جذباتی۔

بھلا اس خاندان میں کوئی عورت سکون کی سانس کیوں نہیں لے پاتی؟

دیکھو ذرا کس طرح دیدہ دلیری سے باہر گھوم رہا ہے عالم۔ تین عورتوں کا قتل کوئی چھوٹی بات ہے بھلا؟

اور ثبوت تو دیکھو کس صفائی سے مٹائے ہیں؟

ارے اسلان بھی تو مشکوک ہے وہ سکندر کی بیٹی والا معاملہ بھول گئے ؟

سارا خاندان ہی کرمنلز کا ہے۔

انتظامیہ کی نااہلی ہے ورنہ یہ سارے یمن اب تک جیل میں چکی پیس رہے ہوتے۔

مجھے تو ان بیچاری عورتوں پر ترس آتا ہے جو اس خاندان کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

ہر آواز، ہر بہتان، ہر جملے بازی کہیں غرق ہو گئی جب سہر اب یمن ایک دیوار گیر بورڈ کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ اخبار کے تراشے، کئی ایسی لاشوں کی تصاویر جن کے گلے کٹے ہوئے تھے، پریولج کلر کے نام کی تمام ہیڈ لائنز اسکے تمام وکٹمز، اور آلہ قتل۔ مختلف بیان، مختلف لوکیشنز، ثبوت، ٹکڑے، سرخ دھاگے۔

بورڈ کے عین بیچوں بیچ تین تصاویر لگی تھیں۔ پہلی سہر اب کی۔ ایک سرخ دھاگہ اسکی تصویر کو ایک اور تصویر سے جوڑ رہا تھا جو نظر نہیں آ رہی تھی کہ اس پر سہر اب کا سایہ پڑ رہا تھا۔

دوسرا وہ تھا جس کی تصویر کے اوپر عالمگیر لکھا تھا۔ سانولی رنگت، بے حد وجیہہ نقوش، کھڑی ناک اور گھنے بال۔ یہ اسکے چہرے کا کلوز اپ تھا۔ وہ یقیناً پر کشش تھا۔ اسکی تصویر سے جڑے دھاگے تین مختلف تصاویر تک جاتے تھے۔ تینوں عورتیں، اور وہ تینوں تصویریں تین لاشوں سے ملتی تھیں۔ عالمگیر کی تین بیویاں۔

تیسری تصویر اسلان یمن کی تھی جسکا سرخ دھاگہ پنار سکندر کی تصویر سے جڑ رہا تھا۔ تصویر کے اوپری حصے پر "گمشدہ" لکھا تھا۔ سہر اب یمن کا خاندان اور اسکے الجھے بکھرے کردار۔ یا شاید سفاک ذہنی امراض کے مارے کردار۔

بورڈ کے اوپری حصے میں ایک کونے پر وہ شہر لکھے تھے جہاں جہاں اسے "اپنے مقصد" کے لیے جانا پڑا تھا۔

لاہور، ایبٹ آباد، پنڈی، مری، اور آخری شہر تھا...... شہر لاہور۔

کسی ہائی پروفائل مقدمے نے سہراب کو کوہ مری آنے پر مجبور نہیں کیا تھا،وہ یہاں اپنے لیے آیا تھا اور وہ اپنے لیے یہاں سے جائے گا۔

★★★★★★★★★★★★

"راولپنڈی"

پنڈی کا راجہ بازاروہ علاقہ ہے جہاں رش دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے آدھا پنڈی اسی جگہ بستا ہو۔رکشے، گاڑیاں، منچلوں کی موٹر سائیکلیں اور پیدل چلنے والوں کا رش ہمہ وقت راجہ بازار کی رونق،اور مصروفیت کالبادہ اوڑھے رکھتا ہے۔

"میری آخری اطلاعات کے مطابق ہم پنڈی خریداری کرنے نہیں آئے تھے۔" قطار در قطار دکانیں،لوگوں کے دھکے اور مختلف کھانوں کی مکس ہوتی خوشبوئیں شاہ زید بے اختیار کراہا۔ہنہہ انو کھالاڈلانہ ہوتو۔

مدیحہ مڑی چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔"جہاں تک مجھے یاد تھا تم مجھے ایک آفیشل کام کا کہہ کر لائے تھے مگر یہاں ہم نے غیر قانونی طریقے سے لوگوں کو زدوکوب کیا اور ایک غیر قانونی حرکت کی جس کے لیے میرا ضمیر مجھے تب معاف کرے گا جب تم کچھ کپڑے،شال اور سوئیٹر بطور رشوت دلواؤ گے۔"

مدیحہ اور شاہ زید کالج کے زمانے سے ساتھ تھے۔اکھٹے پڑھے،اکھٹے بڑے ہوئے،کئی تلخیاں اور تنگیاں دیکھیں مگر ساتھ رہے۔یہاں تک کہ اب وہ دونوں اکھٹے کام کر رہے تھے۔ذہنی ہم آہنگی ایک چھوٹا لفظ تھاوہ چہرہ کا تاثر اورایک دوسرے کی آنکھ کا اشارہ بھی سمجھتے تھے۔

"اب بتاؤ وہ عورت کون تھی۔اسکے بیٹے سے تمھیں کیا پوچھنا تھا،کیوں پوچھنا تھا اور۔۔۔۔۔"سوئیٹر اور شالوں سے بھری ایک دکان میں داخل ہوتے ہوئے مدیحہ پوچھ رہی تھی۔"تم یہ کام کر کیوں رہے ہو؟"

"جس کے گھر ہم گئے وہ عورت اور اسکا شوہر drug paddler ہیں۔ دونوں اچھے خاصے کرمنلز ہیں۔ اور انکا بیٹا برہان خان کے گھر میں کام کرتا تھا برہان خان وہ لڑکا ہے جو پریولج کلر کا آخری شکار تھا۔ میرے سورسز سے پتا چلا ہے کہ اس لڑکے نے وہ قتل دیکھا تھا اور تب سے یہ حواس کھو بیٹھا۔" وہ دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے زیادہ لوگ انکی طرف متوجہ نہیں تھے۔

"اوہ لیکن تم تو ایک سولہ سالہ ڈاکو پر ریسرچ کرنے نکلے تھے یہ بیچ میں سیریل کلر کہاں سے آ گیا؟ ڈونٹ ٹیل می تم واقعی اسے ڈھونڈنے نکل پڑے ہو۔" مدیحہ نے ایک سوئیٹر اٹھا کر کاؤنٹر پر دھرا اور اسکا بل بنوانے لگی۔ زید کچھ الجھا ہوا تھا۔ وہ مسلسل شاہ ویر کا نمبر ملا رہا تھا جو مصروف آ رہا تھا۔ جوزف کے پیغام کے متعلق اسے اب فکر ہونے لگی تھی۔

"خیر اس سب سے یہ تو فائدہ ہوا کہ ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ لڑکا واقعی ذہنی مریض بن چکا ہے۔" وہ کہہ کر اب دکاندار سے دو سو روپے کم کروانے لگی تھی۔ دونوں کی کھچ کھچ سے شاہ زید کا سر دُکھنے لگا۔

"ہو سکتا ہے وہ سچ کہہ رہا ہو۔ آفٹر آل وہ عینی شاہد ہے۔"

مدیحہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "تم ایک معمولی سے کرائم اینالسٹ ہو اور تمھیں معلوم ہو گیا کہ اس لڑکے نے قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ گدھے کا بچا سیریل کلر جس نے سترہ لڑکوں کو جان سے مار دیا اسے اس لڑکے کے متعلق نہیں پتا ہو گا؟"

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟"

"یہی کہ یہ سب اس بچے اور اسکی ماں کا ڈرامہ ہے۔ اس نے کوئی سیریل کلر نہیں دیکھا اگر دیکھا ہوتا تو اب تک وہ مر چکا ہوتا۔ ڈرگز بیچتے ہیں تو یقیناً ڈرگز لیتے بھی ہوں گے اور صاف ظاہر ہے کہ نشے کے پیسے پورے نہ ہوئے تو

انہوں نے بیٹے کو کہانی کار بنا دیا۔" وہ تلخی سے کہہ رہی تھی۔ "آٹھ سو روپے میں دینا ہے تو دو ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔" دوسری بات دکاندار سے کہی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ یہ مکمل جھوٹ ہے ہاں وہ لڑکا مسجد کا پیش امام نہیں ہے لیکن۔۔۔۔۔۔" وہ رکا الجھن سے ایک نظر موبائل پر آتے اس پیغام کو دیکھا۔ کیا شاہ ویر ٹھیک ہو گا؟ کہیں وہ کسی ہسپتال میں تو نہیں؟ کوئی درد سا اسکے سینے میں دھیرے دھیرے ابال اٹھا رہا تھا۔ "لیکن تم نے اسکا چہرہ دیکھا تھا؟ وہ کسی اداکار کا چہرہ نہیں تھا۔"

"اوہ ہاں اداکاروں کی پہچان تو اب تمھیں ہو گی خود جو اداکار ٹھہرے۔"

وہ بگڑ کر کہتے ہوئے دکان سے باہر نکل آئی۔ پیچھے دکان دار صدائیں لگا رہا تھا۔

"او باجی واپس آؤ آٹھ سو کر دوں گا ناراض کیوں ہوتا ہے؟"

وہ آگے چلی گئی مگر شاہ زید نے جیب سے پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر دکاندار کو دیا اور سوئیٹر اٹھا کر باہر آیا۔ مدیحہ تب تک آگے جا چکی تھی۔ زید کے موبائل پر شاہ ویر کی کال آنے لگی تو وہ موبائل پر ہاتھ رکھتا ایک طرف کو ہو گیا۔ یہاں کم لوگ تھے۔ مگر شور یہاں تک آ رہا تھا۔ اس سے گھر جانے کا انتظار تک نہیں ہوا۔

"ویر؟ تم ٹھیک ہو یہ جوزف کس حملے کی بات کر رہا ہے۔؟ تمھیں کہاں چوٹ آئی ہے؟"

سات سمندر پار شاہ ویر کا حلق تک خشک ہو گیا۔ اسکا ہاتھ بے اختیار اس تازہ زخم تک گیا اور اسکا جی چاہا کہ دل کھول کر اس فرنگی کو گالیاں بکے۔ وہ خود بتا دیتا ایک دو دن میں لیکن نہیں۔۔۔۔۔ آہ۔

"یار میں سڑک پار کر رہا تھا اور ایک گاڑی سے ٹکر ہو گئی۔ تھوڑی سی چوٹ آئی ہے اور بس۔۔۔۔۔"

"تم یہاں کھڑے ہو میں تمھیں ڈھونڈ رہی تھی۔" مدیحہ وہاں آ دھمکی۔ اسکے پیچھے وہی دکاندار چلا آ رہا تھا شاہ زید نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ وہ چپ ہو گئی مگر جھپٹ کر جیکٹ اس سے لیا۔

"تم سفید جھوٹ بول رہے ہو مجھے سچ سچ بتاؤ کیا ہوا ہے ؟ اور کہاں ہو اس وقت تم ؟" شور کے باعث وہ چلایا۔

"ہم کو تمہارا پانچ ہزار نہیں چاہیے ہم کوئی بھکاری ہے ؟" دکان دار بھی کڑکتا نوٹ لیے وہیں آ گیا تھا۔ زید نے کنپٹی مسلی۔ رش، شور، فکر سب گڈ مڈ ہونے لگا۔

"تم نے اسے پانچ ہزار دیے تھے ؟ یا اللہ اس سڑے ہوئے پیس کے پانچ ہزار ؟ دماغ لاہور چھوڑ کر آئے ہو ؟"

"میں گاڑی میں جا رہا ہوں ویر مجھے ویڈیو کال کروا بھی۔"

"آٹھ سو والا سوئیٹر پانچ ہزار میں بیچتے ہو ؟"

"او بی بی تمھارے آدمی نے خود پانچ ہزار دیا ہے۔"

"یہ تمھارے ساتھ کون ہے ؟ مدیحہ ؟" ایک تو جسم کا درد اوپر سے کانوں کے پردے پھاڑتی آوازیں شاہ ویر اکتایا۔ "کہاں ہو یار تم آواز ہی نہیں آ رہی۔"

"میں گاڑی میں جا کر تمھیں فیس ٹائم کرتا ہوں۔" اس نے کال کاٹی اور قہر آلود نظروں سے مدیحہ کو

دیکھا۔ "کنجوس عورت اس پانچ ہزار سے اپنا جہیز اور کفن پورا خرید کر آنا۔ جاؤ اب۔"

"ہاں ہاں تم دیکھنا آدھا راجہ بازار انہی پیسوں سے خرید کر آؤں گی۔" وہ بھی سلگی۔

وہ گاڑی میں آ کر بیٹھا اور دوبارہ شاہ ویر کو کال ملائی۔ اب کی بار وہ اپنا لیپ ٹاپ نکال چکا تھا۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے وہ باہر سے آتی آوازیں سننے سے نابلد تھا۔ سکرین کے چوکھٹے میں جو چہرہ نظر آ رہا تھا اسے زید چند لمحوں کے لیے پہچان نہیں سکا۔ آنکھ کے نیچے اور گال کے اوپر جامنی نیل بن گیا تھا۔ وہ کمزور نظر آ رہا تھا۔

"یہ کیا حالت بنوا کر آئے ہو ؟ کسی... گالی... گالی نے تمھیں مارا ہے ؟"

شاہ ویر جانتا تھا اب وہ اگر کچھ چھپائے گا تو زید کا اگلا سفر نیویارک ہو گا۔ وہ دونوں جڑے ہوئے تھے، ایک دوسرے کے متعلق انہیں شبے رہے ہی نہیں تھے۔ سو اس نے سچ کو چنا۔

"بتاتا ہوں۔" لیپ ٹاپ پلنگ پر رکھتے ہوئے وہ الماری تک گیا۔ اور جب وہ واپس آیا تو اسکے ہاتھ میں لکڑی کے تین ڈبے تھے۔ وہ کوئی عام ڈبے نہیں تھے۔ شاہ زید بنگش کی اگلی سانس اسکے سینے میں کہیں مقید ہو گئی۔ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ سکرین کو دیکھ رہا تھا۔ ساکت، شل۔

"تین ماہ ہو چکے ہیں۔ وہ ہر جگہ آتا ہے۔ میرا پیچھا کرتا ہے، مجھے ڈراتا ہے۔ وہ مجھے پاگل بنا رہا ہے۔ لوگ اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ خاموش ہوا، گیلی نگاہیں اٹھا کر سکرین کے پار اپنے بھائی کو دیکھا۔ "وہ میرے بہت قریب ہے، زید۔ مجھے یہ بھی نہیں پتا میرے پاس کتنا وقت ہے۔ پہلے مجھے یہ وہم لگا لیکن یہ وہم نہیں ہے۔ کوئی سیریل کلر مجھے مارنا چاہ رہا ہے۔"

راجہ بازار سارے کا سارا صم بکم ہو گیا۔ سانسوں کا شور اتنا مدھم ہوا کہ انکے چلنے پر شبہ ہونے لگے۔ شاہ ویر نے اپنی ہُڈی پیٹ سے ذرا سا اوپر کی۔ اور شاہ زید کو یکدم گاڑی کے شیشے کھولنے پڑے۔ اسکا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ وہی زخم تھا، وہی نشان۔ صلیب کی صورت بنا ہوا زخم۔ یہ اتفاق اور پرینک نہیں تھا یہ کوئی بھرم بھی نہیں تھا۔ یہ بد صورت حقیقت تھی۔

"پریولج کلر۔۔۔۔۔۔" شاہ ویر نے وہ کہا جو زید اس زندگی میں سننا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے بھائی کے منہ سے ہرگز نہیں۔ "جسے تم آٹھ مہینوں سے ڈھونڈ رہے ہو وہ مجھے ڈھونڈ چکا ہے۔" اسکی آواز میں اپنے لیے بس خالی پن تھا۔ ایسے جیسے وہ بس اپنا قصور پوچھنا چاہ رہا ہو۔ "I don’t want to die"

شاہ زید نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر سکرین تاریک کر دی۔ سب گڈ مڈ ہو رہا تھا۔ سب سلو موشن میں چلا گیا تھا۔ اسکے ہاتھوں سے جان قطرہ قطرہ باہر نکل رہی تھی۔ آسمان اسکے سر پر آ گرا تھا۔

★★★★★★★★★★★★★

سہراب یمن کے کرائم بورڈ کو چھوڑ کر دیوار پر ایک اور بورڈ لگاؤ اور وہاں مختلف تصاویر اور منظر چسپاں کرو تو کہانی رخ ہی بدل چکی تھی۔

انارا طارون الماری کا آخری خانہ کھولے جوتے کے ڈبوں سے جوتے نکال کر وہاں اپنی نئی پسٹل چھپا رہی تھی۔ جہاں پہلے ہی سات ایسی ہی چھوٹی چھوٹی پسٹلز موجود تھیں۔

رئیس بنگش نیہا کے ہاتھوں پر کچھ رقم رکھ رہا تھا اور انکے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا تھا۔

شاہ زید بنگش جس سفر میں نکلا تھا اسکے درمیان میں ہی کسی نے اسکے سارے اعضاء جامد کر دیے تھے۔ ہر سفر ساکن ہو گیا۔

”تمہاری جرات کیسے ہوئی یہ سب کرنے کی؟ تمہیں شرم بھی نہیں آئی؟ وہ ایک معصوم عورت تھی۔“ شاہ ویر بنگش غراتے ہوئے ابتسام کو دیوار سے لگائے کھڑا تھا اسکی آنکھوں میں لہو تھا۔

سہراب یمن جو دنیا کو یقین دلا رہا تھا اسکا تبادلہ حکومتی مرضی تھی، ف وہ بھلا کس مقصد کے تحت اس شہر آیا تھا؟

اسلان شجاع یمن بستے کے اندر جو دیکھ رہا تھا تمہیں اپنے منہ پر حیرت سے ہاتھ رکھنا پڑے گا۔ بیگ میں ڈھیر سارے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ پیسہ، بے تحاشا، بے حساب پیسہ۔ وہ مری کے کاٹیج سے کپڑے اور ضرورت کا سامان نہیں پیسہ لایا تھا۔ اتنا پیسہ اسکے خاندان کے مردوں نے اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا ہو گا جسے وہ بے نیازی سے گاڑی کی ڈگی میں ڈال کر لے آیا تھا۔ اور وہ اسی پیسے کو دفن کر رہا تھا وجہ؟

لکڑی کے ٹکڑوں پر بار بار کلہاڑی سے ضرب لگتی تو ایک عجیب سی آواز پیدا ہونے لگتی۔ جیل کے احاطے میں کئی ایک مجرمین لکڑی کے ٹکڑوں سے مختلف نوادرات بناتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک وہ بھی تھا۔ جو

گردن جھکائے، مضبوط بازوؤں سے مسلسل لکڑی کے ٹکڑوں پر وار کر رہا تھا۔ اسکی دائیں طرف اسکے بنائے ہوئے شاہکار رکھے تھے جو کہ لکڑی کے چھوٹے بڑے ڈبے تھے اور ان کے اوپر چاقو سے ایڑھی ترچھی لکیریں لگی تھی۔

"عالمگیر" کسی نے اسکا نام پکارا تو اس نے گردن اٹھائی، اور یہیں اسی اٹھی ہوئی گردن کے ساتھ ایک آخری تصویر بھی بورڈ کا حصہ بن گئی۔

★★★★★★★★★

"یہ سب کیا ہے؟" وہ کافی پینا چھوڑ کر اپنے سامنے بیٹھے مرد کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

مرد مسکرایا۔ "یہ بُوجھنے کے قصے ہیں۔ یہ تو مجھے تم بتاؤ گی کہ یہ کیا ہے بھرم؛ بقا، یا باطل؟"

عورت کے پاس جواب کے نام پر کچھ نہیں تھا۔

★★★★★★★★★★★★

بھرم، بقا باطل کا بخزہ اول ابھی جاری ہے

اگلی قسط انشاءاللہ جلد